جلد ۱۰۹ اپریل ۱۹۸۸ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

قافلۂ انسانیت کی منزلِ مقصود ——

صلی اللہ علیہ وسلم

رسولِ اکرم

— مرتبہ —

اُمِّ فاروق

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

- عالمِ نسواں کے لیے رسولِ اکرم کی حیاتِ طیبہ میں رہنمائی کے خطوط
- خواتینِ جہاں کے لیے حقوق کا منشور اور فرائض کے نقوش
- رسولِ اکرم کی ازدواجی زندگی، پسند و ناپسند اور ذوقِ لطیف کے خدوخال

طلب فرمائیے:

کالج کی طالبات کے لیے تحفہ

ضخامت	سائز	قیمت:
۲۴۰ صفحات	۳۶ × ۲۳ / ۱۶	ڈیلکس -/۳۵ روپے، پیپر بیک -/۲۵ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۹ | اپریل ۱۹۸۸ء مطابق شعبان ۱۴۰۸ھ | عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر —— ۴۲۴۶۸ ۳۲

زر سالانہ تیس روپے۔ فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پچھلی مرتبہ جو سلسلۂ گفتگو اشارات میں دیا گیا تھا، اُسے التوا میں رکھ کر اپریل کی مناسبت سے حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے متعلق کچھ باتیں پیشِ خدمت ہیں۔ انشاء اللہ آئندہ اشاعت سے اشارات کا سابق سلسلہ بحال کر دیا جائے گا۔

(ادارہ)

علامہ اقبالؒ کی شخصیت برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کے آسمان پر ایسی لمعانی کے ساتھ اُبھری کہ اس کی شعاعوں کے لشکر نہ صرف عالمِ اسلام میں بلکہ آج کی پوری دنیا میں پھیل گئے، اور علم، ادب، فنِ شعر، فلسفہ، انشاء، خطابت وغیرہ کے بہت سے اُفق جگمگا اُٹھے۔

اقبالؒ کا فنی کارنامہ بجائے خود بہت عظیم ہے۔ یعنی اسے اگر نگاہوں کو یکسو کر کے اس کے شعری مقام پر نظر ڈالی جائے تو جہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا نے فن کے پچھلے سارے کارناموں کا جوہر اس نے سمیٹا، بلکہ شاعری کو نئے احساسات و جذبات، نیا طرزِ فکر، نئی تشبیہات اور تراکیب دے کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ایک طرف اس میں بلندی و بالیدگی پیدا ہوئی اور دوسری طرف وسعت اور آفاقیت۔ لیکن اقبالؒ نے فنِ شعر کی دنیا میں ایک تیسرا کام بھی کیا جو بہت مشکل ہونے کے باوجود بہت کامیاب رہا۔ یعنی عربی، فارسی اور اُردو کے سابق شعراء کی کچھ جزوی مثالوں سے ذرا آگے بڑھ کر اسلام کو ایک مذہب کے بجائے ایک تحریک و تہذیب کی پرعظمت شکل میں شعر کے آبگینوں میں جلوہ گر کر دیا۔ اقبال نے فنِ شعر کے ظرف سے زیادہ اسلامی زندگی کی تفصیلات اور جزئیات تک شاعری کی جھولی میں ڈال دیں۔

مگر کیا مجال کہ کہیں یہ محسوس ہو جائے کہ زبان یا فن پر کوئی چیز بار ہے، بلکہ فنی جمال اور شعری کمال اور بڑھ جاتا ہے۔ پڑھنے والے کو ایک طرف شاعری کے نئے مقاماتِ شکوہ دکھائی دیتے ہیں اور دوسری طرف سامنے کی چھوٹی چھوٹی اسلامی روایات اور قدروں کا بالکل نیا وسیع تر مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔

بہ حیثیت شاعر اقبال کا کام اگر یہاں تک ختم ہو جاتا کہ وہ حیاتِ ملّی کی تجدید کے لیے جذباتی سطح پر کچھ اُکساہٹیں پیدا کر دیتا تو اس سے زیادہ کوئی مطالبہ نہ فن اس سے کر سکتا تھا، نہ ملّت۔ لیکن چونکہ وہ فلسفی بھی تھا، تاریخ آشنا بھی، واقفِ اقتصادیات بھی۔ اور احکامِ قرآن اور اشاعِ سنّت کی روشنیوں سے بھی کچھ بہرہ رکھتا تھا، نیز مغلیہ سلطنت کے مٹنے، تحریکِ مجاہدین کے اُبھرنے، پھر ۱۸۵۷ء کے اضطرابات اور تحریکِ خلافت، ترکیہ میں ادارۂ خلافت کے انہدام اور عرب نیشنلزم اور امپیریلسٹ قوتوں کی اسلام دشمنی اور مُسلم دشمنی کا فلم (کچھ ماضیٔ قریب کی تاریخ سے متعلق اور کچھ چشم دید احوال) دیکھ کر ایک سیاسی و تہذیبی حملے سے ہونے والی بربادیوں کا پورا راز دان تھا، لہٰذا وہ صرف سرسری طور پر مروج تصور کے ایک غیر جانب دار شاعر کی طرح نغمے نہیں الاپتا کہ کبھی ایک طرح کا سُر اور کبھی دوسری طرح کی لَے۔ وہ تاریخ کی جنگ گاہ میں متصادم قوتوں میں سے ہر ایک کا ایک مقام اپنی فلسفیانہ فکر سے بھی متعین کرتا ہے اور پھر جذبۂ ایمانی کے ساتھ اس جنگ گاہ میں سلاحِ قلم لے کر اُتر جاتا ہے، اور ساری عمر اسی طرح گزار دیتا ہے۔ جوں جوں وہ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں پہنچتا ہے، شعر کے ذریعے اس کا جہادِ اسلامی مسلسل زور پکڑتا جاتا ہے۔

لیکن شاعری میں وہ اسلام کی بات ایک فقیہہ یا واعظ یا مفتی کے انداز سے نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے ایمانی شعور کے ساتھ محفلِ انسانیت کے اسٹیج پر کھڑے ہو کر اس ساری محفل سے بات کرتا ہے اور شاعری میں جتنی زیادہ سے زیادہ گنجائش ہو سکتی ہے، ثابت کر دکھاتا ہے کہ اسلام ایک آفاقی دین اور بین الانسانی تحریک ہے اور دُنیا کے ہر فرد کے لیے اس کے پاس پیغام ہے۔

اقبال کی شخصیت اور فن کے اس شعور کے ساتھ میں یہ کہتا ہوں کہ وہ دَورِ رواں کے سب سے

بڑے معرکے کے لیے ہر صاحبِ دل کو اور قریبی رابطے کی وجہ سے ملّت کے نوجوانوں کو پکارتا ہے۔ وہ سب سے بڑا معرکہ مادّیت و روحانیت کا ہے، یا کہیے کہ مادّہ پرستی اور خدا پرستی کا۔ (جیسے اقبالؒ نے معرکۂ رُوح و بدن کہا ہے)۔ وہ تہذیبِ مغرب کا تجزیہ کرکے دکھاتا ہے کہ یہ سب مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر کا طلسم ہے اور دوسری طرف وہ اسلام کو اسی حیثیت سے نمایاں کرتا ہے کہ وہ ایک خدا پرستانہ نظامِ تہذیب ہے۔ وہ خود مادّہ پرستی کے خلاف عرصۂ پیکار میں کھڑا ہے، اور جہاں جہاں تک اُس کی آواز جاتی ہے وہ ہر کسی کو اس معرکے کے لیے پکارتا ہے کہ جہاں سے جو کوئی سچی خدا پرستی کی قوّت لے کر اُٹھ سکتا ہو اُٹھے۔

میدانِ جنگ بڑا وسیع ہے۔ علوم اور خیالات کا دائرہ ہے، تعلیم کا حلقہ ہے، لٹریچر کی دُنیا ہے، صحافت اور دوسرے ذرائع ابلاغ ہیں، ادب اور ثقافت ہے، گھریلو زندگی اور نظامِ معاشرت ہے، سیاسی اقتدار اور عدالتی ہیئت ہے، وغیرہ۔ وہ ان سارے میدانوں میں یہ چاہتا ہے کہ خدا پرستوں کی قوتیں مادّہ پرستانہ تہذیب کی فتنہ سامانیوں اور فکری تباہ کاریوں اور اخلاق سوزیوں کے خلاف برسرِ عمل ہو جائیں۔ بلکہ اقبال کا یہ فکری پس منظر سمجھ میں آجائے تو پھر اندازہ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ کس غرض کے لیے وہ ایک الگ خطۂ زمین اُس ملّت کے لیے حاصل کرنا چاہتا تھا جس کے اسلامی رجحانات میں اگر آفاقی رُوح اور بین الانسانی خایرت کا جذبہ اُبھار دیا جائے تو وہ ایک بُنیادی اور بڑے جہانی انقلاب کا ذریعہ بن سکتی ہے:

بدقسمتی یہ ہوئی کہ اقبال کو شروع میں جس محبت و احترام سے سرآنکھوں پہ بٹھانے کے ساتھ اُسے سمجھنے کی کوشش کی گئی اور بعض اصحاب نے تو قرآن کی روشنی میں اقبال کے کلام پہ تفکر کیا (یہ کام اب بھی ہوتا رہتا ہے)، مگر بعد میں اقبال کے فنی کارنامے کو بھی اور ضمناً بعض پہلوؤں سے اس کی شخصیت کو بھی متنازعہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ مثلاً ترقی پسند تحریک کے حلقوں سے آواز اُٹھی کہ اقبال رجعت پسند ہے[1]۔ کچھ لوگوں نے اس کے کلام کو غیرمعیاری

---

[1] پروفیسر کینٹول اسمتھ نے بھی اپنی کتاب "ماڈرن اسلام اِن انڈیا" میں اقبال کے (باقی برصفحۂ آئندہ)

اور انحرافی قرار دینے کی بھی کوشش کی۔ پھر اشتراکیوں نے ایک اور راستہ اختیار کیا۔ اقبالؒ کے بعض اشعار و نکات کو اِدھر اُدھر سے چُن کر یہ دعویٰ کیا کہ اقبال بھی رُوسی انقلاب سے متاثر اور اشتراکی یا سوشلسٹ ذہن کا تھا۔ پھر کچھ لوگوں نے اس کی ذاتی اور گھریلو زندگی کے مختلف احوال کا تجزیہ جو رہے ہیں کرنا شروع کر دیا۔ اور اب دانش وروں کا ایک جتھا (موجودہ مُسلم لیگی حکمرانوں کی تائید و تحسین کے ساتھ) اس دعوے کو لے کر اُٹھا ہے کہ اوّل تو اقبالؒ نے سیکولر اسلام کا تصور پیش کیا ہے جسے سمجھا نہیں جاسکا۔ دوسرے وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ قرونِ اولیٰ کے قوانین اور احکام اور تقاریب اس روشن دور میں ازسرِ نَو رائج کیے جائیں، بخلاف اس کے وہ ایسے اجتہاد کا علمبردار ہے کہ پچھلے سارے سرمایۂ علم و تجربہ کو دریا بُرد کر کے وقت کے تقاضوں کے متعلق نصوص کی نئی تعبیریں کی جائیں اور پھر ان نئی تعبیروں پر ایک ماڈرن فقہ کھڑی کی جائے۔ خواہ اسلام رہے یا نہ رہے، جو کچھ بھی رہے گا، اسی کو اسلام سمجھا جائے گا۔

یہ بڑی سنجیدہ صورت ہے کہ ہماری ایک عظیم تاریخی، علمی اور ادبی شخصیت کو اغوا کیا جارہا ہے۔ کبھی کوئی گروہ اس مہم کے لیے اُٹھتا ہے، کبھی دوسرا گروہ ــــ مطلب سب کا یہ ہے کہ اقبال حقیقت میں جس مقام پر ہے اُس سے اُسے ہٹا کر غائب کر دیا جائے اور ایک نئی طرز کے ادارے میں اُسے نصب کر دیا جائے۔ جیسے ایک گروہ نے کسی زمانے میں حجرِ اَسود کو کعبہ سے چُرا لیا تھا اور کئی سال اُسے غائب رکھا۔ بڑی مشکلوں سے واپس حاصل کیا گیا۔ اِس طرح

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

کارنامے کے دو حصے کیے۔ یعنی جہاں وہ عام طریق سے حسن و جمال یا علم یا ترقی وغیرہ کی بات کرتا ہے، وہاں وہاں تو اسمتھ اُسے ماڈرن کہتا ہے۔ اور جہاں جہاں اقبالؒ اسلام کے حقائق کو اُبھارتا یا مسلمانوں کو پکارتا یا عشقِ نبی (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا ذکر کرتا یا مادہ پرستی کے خلاف آواز اُٹھاتا ہے تو وہ پروفیسر اُسے رجعت پسند قرار دیتا ہے۔

پر اگر کسی شخصیت کو خدا پرستانہ تہذیب کے فکری ایوان سے نکال لے جایا جائے اور اُسے جا کر مادرن سیکولر اسلام کے شعبۂ اجتہاد میں لے جا کر نصب کر دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اثر و قوت کو ایک طرف سے ہٹا کر دوسری طرف لگا دیا جائے۔

اقبال کی فنی شخصیت کا اغوا کرنے والے مختلف عناصر سے (جو اَب ہیں یا آئندہ ہو سکتے ہیں) مجھے یہ پوچھنا ہے کہ تم ذرا اس کی کتاب "اسرار خودی اور رموزِ بے خودی" کو لے کر اس کا سادہ ترجمہ کرو اور یہ بتاؤ کہ اس کے اتنے طویل بیان سے اشتراکیت نکلتی ہے یا سیکولرازم یا مادہ پرستی یا اسلام! ــــ یا کچھ بھی نہیں؟

ایک کیا، کوئی کتاب لے لیں۔ بلکہ یوں کریں کہ ساری کتابوں کو جمع کر کے یہ دیکھیں کہ ان میں اسلامی شخصیتوں، اسلامی اصطلاحات، اسلامی موضوعات، آیات، احادیث، اسلامی تاریخ کے واقعات، تراکیب اور استعارات اور تلمیحات، ملکوں اور مقامات کے نام، کتابوں کے نام، زندگی کے مسائل و مباحث کے متعلق اسلامی زاویوں کا بیان کس قدر ہے۔ ایسی فہرست بنانے کے بعد بتایئے کہ یہ نظام اسلامی کے کسی مخالف کا کلام ہو سکتا ہے یا داعیٔ اسلام کا!

خوب غور کرو اور پھر یہ بتاؤ کہ کیا یہ رویہ صحیح ہے یا نادرست کہ ایک طرف اقبال کو فکری رہنما ماننا، تصورِ پاکستان پیش کرنے والا مدبر ماننا، ترجمانِ حقیقت اور حکیم الامت ماننا، اس کے یوم منانا، اس کے مزار کو سجانا، سنوارنا اور وہاں جا کر پھول چڑھانا اور سلامیاں دینا، ــــ اور دوسری طرف ــــ اس کے اصل مدعائے کلام کو جو پوری طرح واضح اور عیاں ہے ("کیا غضب آئے نگاہوں پہ، جو پنہاں ہوں ہم") اس کو نت نئی تحقیقاتوں کے چاک پر گھما کر اقبال کے کلام سے نئے نئے معانی کی تخلیق کرتے چلے جانا۔ میرے خیال میں تو مذاق ہے۔ اقبالؒ کے منہ میں جس کا جی چاہتا ہے اپنی باتیں ٹھونس دیتا ہے۔ پھر یہ سماں کہ لبرل ازم یا رواداری اور آزادیٔ رائے کے نام پر جتنے منہ، اتنی باتیں، یہ نتیجہ پیدا کرتا ہے کہ اقبالؒ کی آواز بکھر جاتی ہے، اس کے تخیلات کے شہباز پر پھڑپھڑاتے نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔

اگر اقبالؒ کے اثرات سے معاشرے کو دُور رکھنے کا سبب یہ اُلٹی تحقیقاتیں اور ٹیڑھے

پروپیگنڈے نہ ہوتے تو کیا ہم جرائم کے لحاظ سے، جہالت کے لحاظ، افلاس کے لحاظ سے، مالیات کی پستی کے لحاظ سے، زرِمبادلہ کی کمی کے لحاظ سے، تجارتِ خارجہ کے خسارے کے لحاظ سے، غیر ملکی مقروضیت کے لحاظ سے، صنعتی انحطاط کے لحاظ سے، ٹیکسوں اور اس کی قیمتوں کے اضافے کے لحاظ سے، تفرقے کے لحاظ سے، صوبائی نزاعات کے لحاظ سے، سیاست کی کمزوری اور لیڈروں کی بے وقعتی کے لحاظ سے اتنے ہی گئے گذرے ہوتے۔

اقبال رح کے فن اور پیغام کی شعاعوں کو اس طرح بکھیر دیا گیا ہے کہ ہمارا ملی وجود ہی ابھی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہے، گویا کہ ہم سارے زمانے کو روشنیاں بانٹنے والے ہوتے۔

شدید ضرورت ہے کہ صحت مند ذہن کے محقق اور دانشور اقبالؒ کے کلام، فن اور فلسفے اور نظریہ وغایت پر اتنا ٹھوس اور مثبت کام کریں کہ وہی ٹھوس مثبت کام ملت اور خصوصاً اس کے نوجوانوں پر چھا جائے۔ اقبال شناسی کے نام پر ہر وہ کوشش جو ہماری موجودہ بگڑی ہوئی زندگیوں اور مغرب زدگی کو جواز مہیا کرتی ہے، درحقیقت اقبالؒ اور معاشرے کے درمیان گردوغبار کی ایک دیوار کو حائل کرتی ہے۔

حکمتِ سیّد مودودیؒ

شب برات — ۱۵ شعبان - رمضان

شب برات کو عموماً مسلمانوں کا ایک تہوار سمجھا جاتا ہے[1]۔ اس کے کچھ مراسم بھی مقرر کر لیے گئے ہیں جن کی شدت سے پابندی کی جاتی ہے۔ دھوم دھام کے لحاظ سے تو گویا محرم کے بعد اسی کا نمبر ہے۔ مگر — نہ قرآن میں اس کی کوئی اصلیت ہے، نہ حدیث میں، نہ صحابہ کرامؓ کے دور کی تاریخ میں اس کا کوئی پتہ نشان ملتا ہے اور نہ ابتدائی زمانہ کے بزرگانِ دین ہی میں

---

[1] بعض مفسرین کو جن میں حضرت عکرمہؓ سب سے نمایاں ہیں، یہ شبہ لاحق ہوا کہ سورۃ الدخان کی ابتدا میں جس "لَیْلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ" کا ذکر ہے، وہ پندرھویں شعبان کی شبِ برات ہے جو "لیلۃ القدر" (رمضان) سے الگ ہے۔ متعدد تفاسیر میں نے دیکھیں سب نے قرآن کی ان دونوں ذکر کردہ راتوں کو ایک ہی رات قرار دیا ہے۔ مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

"اس رات سے مراد وہی رات ہے جسے سورۂ قدر میں لیلۃ القدر کہا گیا ہے۔ وہاں فرمایا گیا کہ انا انزلنٰہ فی لیلۃ القدر، اور یہاں بیان فرمایا گیا ہے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ۔ پھر یہ بات بھی قرآن مجید ہی میں بتا دی گئی ہے کہ وہ ماہ رمضان کی ایک رات تھی۔ (البقرہ: ۱۸۵)

(تفہیم القرآن - جلد ۴ - سورۃ الدخان - نوٹ ۱ -)

کسی نے اس کو اسلام کا تہوار قرار دیا ہے۔

دراصل اسلام رسموں اور تہواروں کا مذہب ہے ہی نہیں۔ یہ تو ایک سیدھا اور معقول مذہب ہے، جو انسان کو رسموں کی جکڑبندیوں سے، کھیل تماشے کی بے فائدہ مشغولیتوں سے، اور فضول کاموں میں وقت، محنت اور دولت کی بربادیوں سے بچا کر زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی طرف توجہ دلاتا ہے اور ان کاموں میں آدمی کو مشغول کرنا چاہتا ہے جو دُنیا اور آخرت کی فلاح بہبود کا ذریعہ ہوں۔ ایسے مذہب کی فطرت سے یہ بالکل بعید ہے کہ وہ سال میں ایک دن حلوے پکانے اور آتش بازیاں چھوڑنے کے لیے مخصوص کر دے اور آدمی سے کہے کہ تو مستقل طور پر ہر سال اپنی زندگی کے چند قیمتی گھنٹے اور اپنی محنت سے کمائے ہوئے بہت سے روپے ضائع کرتا رہا کر۔

زیادہ سے زیادہ اگر کوئی چیز اسلامی لٹریچر میں ملتی ہے تو وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ شعبان کی پندرھویں شب کو حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہ پایا اور وہ آپؐ کو تلاش کرنے کے لیے نکلیں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے بقیع کے قبرستان پہنچیں۔ وہاں آپؐ کو موجود پایا۔ وجہ دریافت کرنے پر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اس رات کو اللہ تعالیٰ آسمانِ دُنیا کی طرف توجہ فرماتا ہے اور قبیلۂ کلب کی بھیڑوں کے جس قدر بال ہیں، اُس قدر انسانوں کے گناہ معاف کرتا ہے۔ لیکن حدیث کے مشہور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اور اپنی تحقیق یہ بیان کی ہے کہ اس کی سند صحیح طور پر حضرت عائشہؓ تک نہیں پہنچتی۔ بعض دوسری روایات ہیں، جو کم درجہ کی کتبِ حدیث میں ملتی ہیں۔ اس رات کی یہ فضیلت بیان کی گئی ہے کہ اس میں قسمتوں کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ اور پیدائش اور موت کے معاملات طے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سب روایات ضعیف ہیں۔ ہر ایک کی سند میں کوئی نہ کوئی کمزوری موجود ہے۔ اسی لیے حدیث کی قدیم تر اور زیادہ معتبر کتابوں میں کہیں ان کا ذکر نہیں ملتا۔

حدیث کی زیادہ معتبر کتابوں سے جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رمضان کی آمد سے پہلے ہی شعبان کے مہینہ میں ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبری جیسے عظیم الشان منصب پر مامور کیا گیا اور قرآن جیسی لازوال کتاب کے نزول کا آغاز ہوا۔ اس وجہ سے نہ صرف رمضان میں آپ غیر معمولی طور پر عبادت فرمایا کرتے تھے، بلکہ اس سے پہلے ہی آپؐ کی لَو خدا سے لگ جاتی تھی۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ رمضان کے سوا سال کے باقی گیارہ مہینوں میں صرف شعبان ہی ایسا مہینہ تھا جس میں آپؐ سب سے زیادہ روزے رکھتے تھے، بلکہ تقریباً پورا مہینہ ہی روزہ رکھتے گزر جاتا تھا۔ لیکن آپ کا یہ طرزِ عمل اپنی ذات کے لیے خاص تھا اور اُس گہرے روحانی تعلق کی بنا پر تھا جو نزولِ قرآن کے مہینے سے آپ کو تھا۔ رہے عام مسلمان، تو اُن کو آپؐ نے ہدایت فرما دی تھی کہ ماہ شعبان کے آخری پندرہ دنوں میں روزے نہ رکھا کریں، کیوں کہ اس میں یہ اندیشہ تھا کہ اگر عادۃً لوگ اس مہینے کے آخری دنوں میں روزہ رکھنے لگے تو رفتہ رفتہ یہ ایک لازمی رسم بن جائے گی اور رمضان کے فرض روزوں پر خواہ مخواہ دس پندرہ مزید روزوں کا اضافہ ہو جائے گا، اور اس طرح لوگوں پر وہ بار پڑ جائے گا جو خدا نے ان پر نہیں رکھا ہے۔

اسلام میں خاص طور پر یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ جو کچھ خدا نے اپنے بندوں کے لیے لازم کیا ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری چیز بندے خود اپنے اوپر لازم نہ کر لیں۔ کوئی خود ساختہ رسم، کوئی مصنوعی قاعدہ، کوئی اجتماعی عمل ایسا نہ ہو جس کی پابندی لوگوں کے لیے فرض کی طرح بن جائے۔

رمضان کے روزوں کو صرف عبادت اور صرف تقویٰ کی تربیت ہی نہیں قرار دیا گیا ہے بلکہ انھیں مزید برآں اس عظیم الشان نعمتِ ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ٹھیرایا گیا ہے۔

جو قرآن کی شکل میں اس نے ہمیں عطا فرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دانش مند انسان کے لیے کسی نعمت کی شکر گزاری اور کسی احسان کے اعتراف کی بہترین صورت اگر ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس مقصد کی تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ تیار کرے، جس کے لیے عطا کرنے والے نے وہ نعمت عطا کی ہو۔ قرآن ہم کو اس لیے عطا فرمایا گیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی رضا کا راستہ جان کر خود اس پر چلیں اور دنیا کو اس پہ چلائیں۔ اس مقصد کے لیے ہم کو تیار کرنے کا بہترین ذریعہ روزہ ہے۔ لہٰذا نزولِ قرآن کے مہینے میں ہماری روزہ داری صرف عبادت ہی نہیں ہے، اور صرف اخلاقی تربیت بھی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ خود اس نعمتِ قرآن کی بھی صحیح اور موزوں شکر گزاری ہے۔

(تفہیم القرآن۔ جلد ۱۔ سورہ البقرہ۔ حاشیہ ۱۸۷)

تصحیح

سابق شمارہ کے صفحہ ۳/۳ میں درج شدہ آیت کو یوں درست کرلیں: وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ

(ادارہ)

قرآن میں اصحابِ فیل کا واقعہ

جناب محمد رفیق چودھری صاحب۔ ادارہ معارف اسلامی، منصورہ۔ لاہور

قرآن مجید میں سورۂ فیل میں اصحاب فیل (ہاتھی والوں) کے جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اُس کا متفقہ اور مجمع علیہ تفسیر میں دورِ حاضر کے بعض لوگوں نے عجیب و غریب اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اصل واقعہ جس پر سلف سے لے کر خلف تک کے تمام مفسرین کرام کا اتفاق اور اجماع ہے۔ مختصراً یہ ہے کہ یمن کا ایک متعصب عیسائی حکمران ابرہہ ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر ہاتھیوں کے ہمراہ خانہ کعبہ پر حملہ آور ہوا، تاکہ اُسے مسمار کر دے۔ قریش مکہ اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، اس لیے وہ قریب کے پہاڑوں پر چلے گئے۔ جب وہ لشکر مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان مُحَسِّر کے مقام پر پہنچا تو اچانک ایک طرف سے پرندوں کے جھنڈ آ گئے جنہوں نے اُن پر سنگ ریزوں کی بارش کر دی۔ اور جس کے نتیجے میں پورا لشکر ہاتھیوں سمیت تباہ و برباد ہو گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص قدرت کے اعجاز سے خانہ کعبہ کی حفاظت فرمائی اور ابرہہ کے منصوبے کو ناکام بنا دیا۔ یہ واقعہ اسی سال پیش آیا جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی تھی۔ اصحابِ فیل کے واقعہ کی اسی تفسیر پر مفسرین کرام کا چودہ سو برس سے اتفاق اور اجماع موجود ہے۔

اِس کے برعکس دورِ حاضر کے بعض لوگ اس واقعہ کی تاویل یوں کرتے ہیں کہ قریشِ مکہ نے ابرہہ کے لشکر کا باقاعدہ مقابلہ کیا تھا اور پہاڑوں میں مورچے بنا کر گوریلا جنگ لڑی تھی۔

اصحابِ فیل پر قریش نے ایسا پتھراؤ کیا کہ اُن کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اس دوران میں تیز آندھی (حاصِب) آئی، جس نے رہی سہی کسر نکال دی اور ابرہہ کا لشکر تباہ و برباد ہو گیا۔ اس کے بعد ان کی نعشوں کو نوچنے اور کھانے کے لیے اور جوارِ کعبہ سے تعفن ختم کرنے کے لیے گوشت خور قسم کی چڑیاں پہنچ گئیں جنھوں نے میدانِ جنگ کو آلودگی سے پاک و صاف کر دیا۔

تجدد پسند حضرات واقعۂ فیل کی اس تاویل کے حق میں جو کچھ کہتے ہیں وہ قرآن مجید کے مسلمہ اُصولِ تفسیر کے خلاف کہتے ہیں اور اس تفسیر کے خلاف کہتے ہیں جس پر سلف سے لے کر خلف تک کے تمام مفسرین کرام کا اجماع اور اتفاق موجود ہے۔

ان متجددین کی ایک نفسیاتی کمزوری ہے کہ وہ مغرب سے مرعوب ہو کر دینِ اسلام اور قرآن مجید کی ایسی تعبیر و تاویل کرنے کی سعی کرتے ہیں جس میں وہ موجودہ دور کی عقلیت پسندی (RATIONALISM) پہ ایمان لا کر قرآنی معجزات کا صاف انکار کر دیتے ہیں۔ ان کے ہاں فرشتوں کا کوئی وجود نہیں۔ انسانوں سے الگ جنوں کی کوئی مخلوق نہیں۔ وہ ابلیس بھی ان کے نزدیک مر چکا ہے جس نے آدم علیہ السلام کے آگے سجدہ ریز ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ بلکہ خود آدم علیہ السلام نام کا کوئی نبی بھی اُن کے خیال میں نہیں ہو گزرا۔ اُن کی رائے میں فرعون اور اس کا لشکر محض سمندر کے مد و جزر کی وجہ سے غرقاب ہوا تھا اور ان کی دانست میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم واقعۂ معراج کی صورت میں کبھی آسمانوں پر تشریف نہیں لے گئے تھے۔ قرآنی قصص اور واقعات کا اعجازی پہلو ختم کر دینے کا سودا ان لوگوں پہ ایسا سوار ہے کہ انھوں نے اصحابِ فیل کے واقعہ میں بھی قدرتِ الٰہیہ کا اعجازی پہلو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اسے بھی عام جنگی واقعات کی طرح ایک واقعہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے۔

ہماری رائے میں ان متجددین نے سورۂ فیل کے واقعہ کی جو تاویل کی ہے وہ کئی وجوہ سے غلط اور بے بنیاد ہے۔

قرآنِ مجید کا اُسلوبِ بیان سب سے پہلے وہ اس سورہ میں قرآنِ مجید کے اُسلوبِ بیان پر غور کیا جائے تو آغاز ہی میں اَلَمْ تَرَ (کیا تو نے نہیں دیکھا) کے الفاظ آتے ہیں۔ یہ اُسلوبِ بیان قرآن مجید میں عام اور غیر معین مخاطب کے لیے آتا ہے۔ جسے اصطلاحاً "خطاب بغیر معین"

کہا جاتا ہے اور استفہامِ انکاری کے طور پر آتا ہے۔ اس طرح کے اسلوب میں کوئی خاص فرد یا گروہ مراد نہیں ہوتا، بلکہ پوری نوعِ انسانی سے خطاب کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں آیا ہے کہ:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ (الفجر ۸۹ : ۶)	کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے قومِ عاد سے کیا سلوک کیا۔

اِس جگہ پر کوئی فرد یا گروہ مخاطب نہیں ہے بلکہ یہ خطاب عام ہے اور اس کا خطاب معیّن نہیں ہے۔ تمام لوگ اس کے مخاطب ہیں۔

اِسی طرح ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ (الفرقان ۲۵ : ۴۵)	کیا تُو نے اپنے رب کی اس قدرت پر غور نہیں کیا کہ اُس نے سائے کو کیسے پھیلایا ہے۔

اِس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک خاص قدرت — اشیا کے سایوں کا گھٹنا بڑھنا۔ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس میں بھی کوئی خاص شخص یا گروہ مخاطب نہیں ہو سکتا۔

بعینہٖ سورۂ فیل کے آغاز میں اَلَمْ تَرَ کا خطاب بھی کسی خاص فرد یا گروہ کے لیے نہیں ہے۔ اس لیے اس سے قریش کا گروہ مُراد لینا ہرگز درست نہیں ہے۔

تفسیر القرآن بالقرآن قرآن مجید کی تفسیر کا سب سے پہلا اُصول جسے ہمارے مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں، یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے۔ اس اُصول کے مطابق جب ہم سورۂ فیل پر غور و تدبّر کرتے ہیں تو اسی اُسلوب اور انداز میں قرآن مجید سے کئی نظیریں مل جاتی ہیں۔

ا: پہلی نظیر یہ ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ (الفجر ۸۹ : ۶)	کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے قومِ عاد سے کیا برتاؤ کیا؟

اس آیت کے اندازِ بیان ہی سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ قومِ عاد کے لیے جس عذابِ الٰہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس میں انسانی کوشش اور کسب کو کوئی دخل نہیں ہے۔ جو عذاب قومِ عاد پر بھیجا گیا وہ کوئی انسانی فعل نہ تھا، بلکہ صرف اور صرف قدرتِ الٰہیہ کا کرشمہ تھا۔ اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ (کیا تُو نے دیکھا کہ تیرے رب نے کیا کیا) کا اسلوب اس امر کا متقاضی ہے کہ اس کے ضمن میں واقع ہونے والے فعل کا صرف رب ہی فاعل ہو۔

بالکل اسی طرح سورۂ فیل کے آغاز میں پہلی آیت یوں ہے کہ:

اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ ؕ (الفیل: ۱)

کیا تُو نے دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔

اِس آیت زیرِ بحث کا اسلوبِ بیان بھی اس امر کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ آگے جو فعل بیان ہوگا اُس کا فاعل صرف اور صرف ربِ کریم ہی ہے۔ بندوں کے فعل کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ لہٰذا اصحابِ فیل کے واقعے کی تفسیر میں ابرہہ کے لشکر کو تباہ کرنے میں بندوں کا خواہ وہ قریش ہوں یا کوئی اور قطعاً کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔ قریش کے کسی فعل کو بیان کرنے کے لیے یہ اسلوب ہرگز مناسب نہیں ہوسکتا۔

ب — دوسری نظیر سورۂ فرقان کی آیت ۴۵ ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

اَلَمۡ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیۡفَ مَدَّ الظِّلَّ ۔

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے سایے کو کیسے پھیلا دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اشیاء کا سایہ قدرتِ الٰہی سے گھٹتا بڑھتا ہے اور سورج کی روشنی کے مختلف زاویوں سے بدلتا رہتا ہے۔ اللہ کی اس قدرت میں فعلِ انسانی کا ہرگز کوئی دخل نہیں ہے۔ اُسلوبِ بیان یہاں پر بھی بالکل وہی ہے جو سورۂ فیل کے آغاز میں وارد ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اپنی قدرت کی ایک نشانی ایک جگہ بتانا چاہتا ہے اور اپنی قدرت کی دوسری نشانی دوسری جگہ بتا رہا ہے۔ ایک ہی اُسلوب اور انداز بیان ہے جس میں انسانی کوشش اور کسب کا کوئی حصہ نہیں۔ سب کچھ قدرتِ الٰہیہ کی کرشمہ سازیاں بیان ہوئی ہیں۔

ج ۔۔۔ تیسری نظیر سورۂ عنکبوت آیت ۱۹ میں ہے کہ:

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ	کیا وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ اللہ کس طرح تخلیق کی ابتداء اور اس کا اعادہ کرتا ہے؟

یہ حقیقت ہے کہ اشیا کو پہلی بار پیدا کرنا یا دوبارہ پیدا کرنا تنہا اللہ کی قدرت وصنعت ہے ۔ اُس میں انسانی جدوجہد کو کوئی دخل حاصل نہیں ہے ۔ اس آیت کا اندازِ بیان بھی سورۂ فیل کے آغاز جیسا ہے ۔ لہٰذا اصحابِ فیل کی تباہی و بربادی میں بھی قریش کا کوئی عمل دخل شامل نہیں ہوسکتا ۔

د ۔۔۔ چوتھی نظیر سورۂ نوحؑ کی آیت نمبر ۱۵ ہے جس میں ارشادِ الٰہی ہے کہ:

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کس طرح اوپر تلے سات آسمان پیدا کیے ہیں ۔

اور واضح ہے کہ جس طرح سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر تلے پیدا کرنے میں کسی انسان کے کسب وفعل کو کوئی دخل نہیں، بلکہ یہ سراسر اللہ کی قدرت وصنعت کا نتیجہ ہے ۔ اسی طرح اصحابِ فیل کا تذکرہ بھی اسی انداز سے کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اُن کی ہلاکت و بربادی میں بھی قریش یا دوسرے انسانوں کی کوئی جدوجہد شامل نہیں ہے ۔ جس طرح ایک مقام پر اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا ظہور ہے ۔ اسی طرح دوسرے مقام پر بھی اُسی اُسلوب میں اللہ تعالیٰ ہی کی قدرتِ قاہرہ کی نمود ہے ۔

اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ کے معنی سورۂ فیل کی تفسیر و تاویل میں متجددین حضرات نے اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ کے معنی سمجھنے میں بھی غلطی کی ہے ۔ قرآن مجید میں جہاں بھی کسی قوم کی ہلاکت و تباہی کا ذکر آیا ہے اور اس سلسلے میں اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ آیا ہے تو وہاں لازمی طور پر اس کے بعد آنے والا اسم ہی موجبِ ہلاکت و تباہی کے طور پر آیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کو عذاب کا اصل ذریعہ قرار دیا ہے ۔ قرآن مجید میں اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں ۔ مثال کے طور پر ایک مثال ملاحظہ ہو:

ا ـــ ارشادِ الٰہی ہے کہ:

وَ فِیْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ (الذاریات ۵۱:۴۱) — اور عاد کے بارے میں اجب ہم نے اُن پر خشک آندھی چلا دی۔

اِس مقام پر اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ کے بعد جو الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ (خشک آندھی) ہے وہی قومِ عاد پر عذاب کی صورت ہے جس سے اُن کی ہلاکت و بربادی ہوئی۔ بالکل اسی طرح اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ (اور ہم نے بھیجے اُن پر پرندے جھنڈ کے جھنڈ) میں بھی اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ کے بعد جو طَیْرًا اَبَابِیْلَ (جھنڈ کے جھنڈ پرندے) آیا ہے تو یہی عذابِ الٰہی کی صورت ہے جس کے ذریعے اصحابِ فیل کی تباہی و بربادی ہوئی۔

ب ـــ دوسری مثال قرآن مجید کی سورۃ سبا کی آیت ۱۶ ہے:

فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ سَیْلَ الْعَرِمِ — اور پھر ہم نے ان پر بند کا سیلاب بھیج دیا۔

اس میں بھی قومِ سبا پر سَیْلَ الْعَرِمِ (بند کا سیلاب) بھیجا گیا اور یہی چیز اُس قوم کی ہلاکت اور تباہی کا سبب بنی تھی۔ بعینہٖ سورۂ فیل میں بھی طَیْرًا اَبَابِیْلَ ہی اصحاب فیل کی ہلاکت و بربادی کا ذریعہ ہیں، نہ کہ قریش کی طرف سے ابرہہ کے لشکر پر کنکر پھینکنا موجبِ ہلاکت ہے۔ قرآن مجید کا اندازِ بیان اپنے نظائر کے ساتھ ہی وضاحت کرتا ہے کہ یہاں بھی طَیْرًا اَبَابِیْلَ ہی کو اصحابِ فیل کی تباہی اور ہلاکت کا سبب قرار دیا جائے۔

ج ـــ تیسری مثال سورۂ الذاریات کی آیت نمبر ۳۳

لِنُرْسِلَ عَلَیْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِیْنٍ۔ — تاکہ ہم ان پر کھنگر کے پتھر برسائیں۔

اس مقام پر قومِ لوطؑ کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے لِنُرْسِلَ عَلَیْهِمْ کے بعد حِجَارَةً مِّنْ طِیْنٍ (کھنگر کے پتھر) آیا ہے اور یہی چیز قومِ لوط کی ہلاکت و بربادی کا سبب اور ذریعہ بنی تھی، بلکہ یہی صورت واقعہ اصحابِ فیل میں بھی ہے۔ جہاں اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ کے بعد طَیْرًا اَبَابِیْلَ آیا ہے۔ لہٰذا یہی طَیْرًا اَبَابِیْلَ ہی اصحابِ فیل کی ہلاکت و تباہی کا موجب

تھے۔ قریش کی جانب سے پتھراؤ کا مفہوم قرآن مجید کے اس اسلوب سے اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

تَرْمِیْھِمْ کا مفہوم

متجددین اس سورہ میں تَرْمِیْھِمْ کے فعل کا فاعل قریش کو قرار دیتے ہیں۔ اس بنیاد پر کہ آغازِ سورہ میں اَلَمْ تَرَ میں قریش مخاطب ہیں۔ اس لیے تَرْمِیْھِمْ میں بھی تَرْمِیْ کا خطاب صیغۂ واحد مذکر حاضر کی صورت میں قریش ہی کے لیے ہے۔ مگر یہ ان حضرات کی اپنی ذہنی اختراع اور اُپج ہے۔ سورۂ فیل میں اَلَمْ تَرَ کے خطاب کے بارے میں ہم پہلے واضح کرچکے ہیں کہ اس طرح کا خطاب عام اور غیر معین ہوتا ہے اور اس سے کوئی خاص فرد یا گروہ مُراد لینا قرآن مجید کے عام اسلوبِ بیان کے خلاف ہے۔ اس لیے صرف قریش کو اس کلام کا مخاطب سمجھنا قطعاً صحیح نہیں ہوسکتا۔ اِس صورتِ حال میں تَرْمِیْھِمْ کے فعل میں قریش کو فاعل قرار دینا صریح طور پہ قرآن مجید کی معنوی تحریف ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ تَرْمِیْھِمْ میں فاعل کی ضمیر اپنے قریبی مرجع طَیْرًا اَبَابِیْلَ کی طرف لوٹتی ہے۔ اور یہاں یہ مفہوم مراد ہے کہ یہ پرندوں کے جھنڈ ہی تھے کہ جو ہاتھی والوں پر کنکریاں پھینکتے تھے اور جس کے نتیجہ میں اصحابِ فیل کا لشکر تباہ و برباد ہوگیا۔

متجددین نے یہاں پر ایک اور نکتہ بھی نکالا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عربی زبان میں رَمْیٌ کا فعل کسی چیز کو صرف بازو یا فلاخن کے ذریعے پھینکنے کے معنوں میں آتا ہے۔ اور اُوپر سے کسی چیز کو گرانے کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں ہوسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ عربیت میں رَمْیٌ کا لفظ کئی معنوں میں آتا ہے۔ اس کے معنی کسی چیز کو ہاتھ یا فلاخن سے پھینکنے کے بھی ہیں۔ اور بلندی سے نشانہ باندھ کر کوئی چیز نیچے گرانے کے معنی میں بھی رَمْیٌ ہی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ دراصل اس لفظ کے مفہوم میں بلندی یا پستی کا کوئی تصور نہیں ہے، بلکہ کسی چیز کا نشانہ لے کر اس پر کوئی شے پھینکنا اس لفظ کا بنیادی مفہوم ہے۔ اہلِ عرب آج کل لڑاکا اور بمبار طیاروں کی گولہ باری اور بمباری کے لیے بھی یہی رَمْیٌ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اور قرآن مجید میں رَمْیٌ کے مجازی معنی "کسی پر

تہمت لگانے"، "الزام تراشی کرنے" اور "بہتان طرازی کرنے" کے بھی آتے ہیں۔
جیسا کہ سورۂ نور آیت نمبر ۴ میں ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ — اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت (زنا) لگاتے ہیں۔

لہٰذا رَمیٰ کے لفظ کو صرف بازو یا فلاخن کے ذریعے کسی چیز کے پھینکنے کے معنوں میں محدود اور منحصر کر لینا عربیت کے خلاف ہے۔

(باقی)

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں، ان کا خاص احترام ملحوظ رکھا جائے۔

(ادارہ)

سب کے لیے قابلِ قبول شریعت[1]

جناب محمد تقی عثمانی صاحب

۱۳ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۸۷ء کے روزنامہ "جنگ" میں صفحہ اول پر جلی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی ہے:

> " مدینہ منورہ (نمائندہ خصوصی) وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے مدینہ منورہ میں پاکستانیوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ملک میں وہی شریعت نافذ ہوگی جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو"[2]

کاش کہ ہمارے ملک کے انتظامی سربراہ اس کے بجائے یہ فرماتے کہ "ملک میں وہ شریعت نافذ ہوگی جو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے قابلِ قبول ہو" لیکن درحقیقت

---

[1] تازہ البلاغ کا اداریہ (بشکریہ البلاغ) نقل کیا جا رہا ہے۔ ہم نے عنوان بھی بدل دیا ہے، اور کچھ حواشی بھی لکھے ہیں۔ امید ہے کہ ادارۂ البلاغ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ (خ ۔ ص)

[2] اس سے تو یہی مفہوم نکلتا ہے کہ کوئی چیز اکبر کے "دینِ الٰہی" کے طرز کی ایجاد کی جانے والی ہے۔ مگر خود اس دینِ الٰہی پر بھی تو سب متفق نہیں ہو سکتے، بلکہ اختلافات و نزاعات میں اضافہ ہو جائے گا۔ دوسری صورت میں حل یہی رہ جاتا ہے، جسے حکمران گروہ اور اُن کے حامی دانشوروں نے اُچھالا بھی ہے کہ اسلامی سیکولرازم یا سیکولر اسلام ہونا چاہیے۔ شریعت کا سارا جھگڑا مٹ جاتا ہے۔ مگر کیا اختلافات اس حل کے بارے میں (باقی بر صفحہ آئندہ)

یہ فقرہ اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ ذہن میں " نفاذ شریعت " کا نہ صرف یہ کہ تصور واضح نہیں ہے، بلکہ وہ " شریعت " اور اس کے نفاذ کے بارے میں شدید غلط فہمیوں میں اُلجھا ہوا ہے ۔ یہ غلط فہمیاں ایک ایسی ذہنیت کی پیداوار ہیں جس نے اس ملک میں چالیس سال سے نفاذ شریعت جیسے اہم مسئلے کو معرضِ التوا میں ڈالا ہوا ہے ۔

اِس ذہنیت کی پہلی خرابی تو یہ ہے کہ اس کے نزدیک " شریعت " کا نفاذ عوام کی مرضی کے تابع ہے ۔ اگر عوام چاہیں گے تو وہ نافذ ہو گی، ورنہ نافذ نہیں ہو گی ۔ اِس طرزِ فکر کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ایک عرصے سے " جمہوریت "، " جمہوری اقدار "، " جمہوری افکار " اور " جمہوری آزادیوں " کا وظیفہ سمجھے بُوجھے بغیر اتنی کثرت سے پڑھا ہے کہ " جمہوریت " بذاتِ خود " غیر مطلق " بن کر رہ گئی ہے، وہی ہمارے فکر و عمل کا آخری ہدف بنی ہوئی ہے، اُسی کے قیام اور بحالی کے لیے ہم نے تن من کی بازی لگا رکھی ہے، اُسی کو ہم نے ایسا مرکزِ نجات قرار دے رکھا ہے کہ گویا ہماری اجتماعی فلاح و بہبود کا ہر کام اسی " جمہوریت " سے حاصل ہو گا، اور جو بھلائی " جمہوریت " کے علاوہ کسی اور ذریعے سے حاصل ہو، وہ بھلائی کہلانے کی مستحق ہی نہیں ہے ۔

اسی ذہنیت کا ایک شاخسانہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک " اسلام " بھی وہی معتبر ہے جو جمہوری طریقوں سے یا جمہوری روایات کے تحت آئے ۔ اس کے بغیر (معاذ اللہ) اسلام کی کوئی بات بھی قابلِ قبول نہیں ہے ۔

واقعہ یہ ہے کہ جب تک یہ اُلٹا طرزِ فکر باقی رہے گا، ملک میں حقیقی اسلام کا نفاذ ہرگز نہیں ہو سکے گا، اس لیے کہ یہ طرزِ فکر " اسلام " اور " شریعت " کے بنیادی مفہوم ہی سے

البقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ:

بھی اتنے ہی شدید نہ ہوں گے ۔

استدلال کی راہ پر تو آپ لوگ دو قدم بھی نہیں چل سکتے، بس جذباتی نکتے چھانٹتے رہیے اور قوم کی تباہی کے عمل میں اپنا حصہ ادا کرتے جائیے ۔ آخرت میں آپ کو بڑی جزا ملے گی ۔

(ف ۔ ص)

متضاد ہے۔ "اسلام" اللہ تعالیٰ کے آگے جُھک جانے کا نام ہے، اور اس کی "شریعت" کے واجب العمل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کا حکم ہے، اور ایک بندے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ اُسے مان کر اس پر عمل کریں۔ خواہ عوام اُس سے خوش ہوں یا ناراض ہوں[1]۔ اتباعِ شریعت کا مقصد مخلوق کو نہیں، خالق کو راضی کرنا ہے۔ لہٰذا اس کے نفاذ کے پیچھے قوتِ حاکمہ عوام کی مرضی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔ "اسلام" عوام کے پیچھے پیچھے چلنے اور اُن کی خواہشات کی پیروی کرنے کے لیے نہیں، ان کی قیادت و رہنمائی کرنے اور انہیں نفسانی خواہشات کی غلامی سے نکالنے کے لیے آیا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ۔

"اگر حق ان لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جاتا تو آسمان و زمین میں فساد پھیل جاتا۔"

"اسلام" تو ایسے ماحول میں آیا تھا کہ اس کے اِرد گرد عوام کی اکثریت شروع میں اُسے ناپسند کرتی تھی، اگر "عوام کی مرضی" ہی فیصلہ کن ہوتی تو اسلام کو کبھی بھی نافذ ہونا نہیں چاہیے تھا۔ وہ تو ہمیشہ مخالفین کے نرغے میں پروان چڑھا ہے، اس نے لوگوں کے طعنے سہ کر اور ملامتیں سن کر اپنی راہ بنائی ہے اور عوام کی خواہشات کے پیچھے چلنے کے بجائے اُن کی اصلاح کو اپنی منزلِ مقصود قرار دیا ہے۔ لہٰذا "اسلام" کو "عوام کی مرضی" اور "جمہوریت" کے تابع قرار دینا درحقیقت اسلام کے بنیادی تصور ہی سے متضاد ہے۔

پھر یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ عموماً "سب کے لیے قابلِ قبول" ہونے کے اس "نظریے" کی

---

[1] ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں بہ حیثیت داعیٔ اقامتِ شریعت ہماری ذمہ داری یہ بھی ہے کہ عوام کو شریعت اور اس کے قانون و مقاصد کے بارے میں مطمئن کریں اور ان میں جذبۂ محبتِ شریعت پیدا کر کے ایک ایسا رضاکارانہ رجحانِ اطاعت اُبھاریں کہ وہ نہ خود مزاحم ہوں اور نہ اسلام دشمن طاقتیں اور منحرفینِ اسلام اُن کو آلۂ کار بنا کر فتنہ و فساد برپا کر سکیں۔ اس ذمہ داری کو پورا کیے بغیر اور اسے بالکل خارج از بحث قرار دے کر پُرامن طریقوں سے کام چلانا شاید ممکن نہ ہو (ن۔ ص)

ساری زد بیچاری "شریعت" ہی پر پڑتی ہے۔ یہ خیال ہمارے "جمہوریت پسند" حکام اور دانشوروں کو بہت کم آتا ہے کہ جو قوانین ہم پر چالیس سال سے مسلط چلے آرہے ہیں وہ کتنے افراد کے لیے "قابلِ قبول" ہیں؟ وہ کون سے عوام ہیں جنھوں نے ان قوانین کو سندِ منظوری عطا کی ہے؟ اور "سب کے لیے قابلِ قبول" کی یہ شرط ان قوانین پر کیوں لاگو نہیں ہوتی؟ ــــ وہاں تو حال یہ ہے کہ ایک بدیسی اور غیر مسلم حاکم ہمارے سینوں پر بندوق رکھ کر یہ قوانین ہمارے سروں پر مسلط کر گیا۔ اور ہم ہیں کہ انہیں چالیس سال سے اپنے اُوپر نہ صرف لادے چلے آرہے ہیں، بلکہ مسلمان عوام کی فریاد و فغاں کے باوجود اس بات پر مصر ہیں کہ یہ قوانین غیر محدود مدت تک عوام پر مسلط رہیں گے، "تا آنکہ ایسی" شریعت" وجود میں نہ آجائے جو "سب کے لیے قابلِ قبول ہو"۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اگر اسلام کو ٹھیک ٹھیک نافذ کیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کے ذاتی مفادات کو نقصان پہنچے گا، کسی کی آمدنی کم ہو جائے گی، کسی کے خرچ میں اضافہ ہوگا، کسی کی لیڈری جاتی رہے گی، کسی کے منصب پر حرف آئے گا، کسی کی بے مہار آزادی میں فرق پڑے گا، کسی کے عیش و تنعم میں کمی آئے گی، اور ایسے افراد جو ملکی و ملی مسائل کو اسی قسم کے مفادات کے دائرے میں رہ کر سوچتے ہیں، وہ یقیناً ایسے احکام کے نفاذ کی مخالفت کریں گے، یا کم از کم انہیں ناگوار سمجھیں گے، جو ان کے ذاتی مفاد کے خلاف ہیں۔ اس کے علاوہ اسی ملک میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کی تعداد کم ہے، لیکن اثر و رسوخ خاصا ہے۔ اور وہ نظریاتی طور پر اسلامی قانون کے بجائے لادینی طرزِ زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ اور نفاذِ اسلام کے ہر اقدام کی کسی نہ کسی حیلے بہانے سے مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ اسلام کے ٹھیک ٹھیک نافذ ہونے سے کیسے خوش ہو سکتے ہیں؟ لہٰذا "سب خوش رہیں" کی پالیسی کے ساتھ "شریعت" کا نفاذ عملاً ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر شریعت پر عمل کرنا ہے، اور اللہ کے لیے کرنا ہے تو اس کے لیے کچھ حلقوں کی مخالفت مول لینی ہی پڑے گی، اگر ہم اس مخالفت کے لیے تیار نہیں ہیں تو نفاذِ شریعت کے کام سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو لینے چاہییں۔

تیسرے یہ "سب کے لیے قابلِ قبول" ہونے کی شرط تو ایسی ہے کہ اگر اس پر ٹھیٹھ معنی میں

عمل کیا جائے تو کسی جمہوری ملک میں کوئی سیکولر قانون بھی نافذ نہیں ہو سکتا، کوئی بڑے سے بڑا جمہوری ملک بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے تمام قوانین سے اس کے تمام باشندے مکمل طور پر مطمئن اور خوش ہیں، کیونکہ سب کو پوری طرح خوش رکھنے کا کوئی طلسماتی نسخہ اس بظاہر جمہوری حکومت کے پاس بھی نہیں ہے جسے "عوام کی حکومت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں بھی زیادہ سے زیادہ یہی کیا جا سکتا ہے کہ اکثریت کی منظوری حاصل کر لی جائے، اور وہ اکثریت بھی قانونی اکثریت ہوتی ہے جس کا حقیقی اکثریت ہونا ضروری نہیں ہے۔

اب یہ منطق کس قدر عجیب ہوگی کہ دُنیا کی ہر بات کو نافذ کرنے کے لیے تو اکثریت کا اتفاق کافی ہو، لیکن "شریعت" کے نفاذ کے لیے سب کا اتفاق ضروری قرار دیا جائے، جس کا حصول کم از کم اسباب و ظواہر کی اس دُنیا میں عملاً ناممکن ہے۔

محترم وزیر اعظم نے جو بات کہی ہے کہ "ایسی شریعت نافذ ہوگی جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو" تو شاید اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہو کہ ہمارے ملک میں مختلف فرقے یا مکاتبِ فکر پائے جاتے ہیں، اور نفاذِ شریعت کے لیے ان سب کا اتفاق ضروری ہے۔

لیکن اس سلسلے میں بھی ہماری گذارش یہی ہے کہ اگر اسی اتفاق کا مطلب یہ ہے کہ ہر ہر جزوی قانون پر تمام مکاتبِ فکر کا اتفاق ضروری ہے تو ایسا اتفاق بھی بحالاتِ موجودہ ناممکن ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کے فرقہ وارانہ اختلافات کا جو شور مچا ہوا ہے، کم از کم قانونی مسائل میں یہ اختلافات اتنے زیادہ اور اتنے سنگین نہیں ہیں، تاہم بہت سے جزوی قوانین ایسے ہیں جن میں مختلف مکاتبِ فکر کے نظریات آپس میں متضاد ہیں، اور جزوی ان قوانین کی حد تک سب کا اتفاق حاصل نہیں ہو سکتا۔[1]

---

[1] آخر اب سے کچھ ہی عرصہ پہلے تک قانونِ شریعت نافذ رہا۔ جب کہ مختلف فرقے اور فقہی اختلافات بھی موجود تھے۔ کیا وجہ ہے کہ اب انکار کا یہ حیلہ نکال لیا گیا ہے (باقی بر صفحہ آئندہ)

کیا اس عدم اتفاق کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ شریعت کبھی نافذ نہ ہو، اور انگریزی قانون بدستور مسلط رہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے، اور اس مسئلے کا حل معقولیت کے ساتھ تلاش کیا جائے تو اس کے دو ہی راستے عقلاً ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی بالاتر اتھارٹی ایسی ہو جو ان مکاتبِ فکر کے نظریات میں حق و باطل کا فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو، اور اس فیصلے کے مطابق جو نظریہ حق ہو، اُسے قانون بنا دیا جائے۔ لیکن اگر ایسی کوئی اتھارٹی موجود نہیں ہے تو رفعِ نزاع کا کوئی راستہ اس کے ممکن نہیں ہے کہ بنیادی طور پر شریعت کی اُس تعبیر کو اختیار کیا جائے جو ملک کے اکثریتی مکتبِ فکر کی تعبیر ہو۔ البتہ جو معاملات عبادات اور نکاح و طلاق اور وراثت سے متعلق ہیں، اُن میں ہر مسلم مکتبِ فکر کے لیے الگ قانون سازی کی جائے۔

چنانچہ ۱۹۵۱ء میں ملک کے تمام مکاتبِ فکر کے سربرآوردہ علماء نے جمع ہو کر جو ۲۲ دستوری نکات مرتب کیے تھے، اس میں سب نے اِس اُصول پر اتفاق کیا تھا کہ ملک کا عام قانون ایک ہوگا، لیکن ہر مکتبِ فکر کے شخصی قوانین میں اسی مکتبِ فکر کی تشریح و تعبیر معتبر ہوگی اور یہی بات ۱۹۷۳ء کے دستور میں بھی طے کر دی گئی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا اس مسئلے کا حقیقت پسندانہ منصفانہ اور قابلِ عمل حل کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

یہ حل ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۳ء میں علماء کے مشترک اجتماع میں بھی تجویز کیا گیا تھا، اس کے بعد

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

کہ یہاں چونکہ مختلف فرقے ہیں اور فرقوں کا اختلاف ہے، لہٰذا نفاذِ شریعت ممکن ہی نہیں۔ سیدھی طرح کیوں نہیں مانتے کہ اب سپرپاورز نہیں مانتیں اور جاگیردار اور سرمایہ اور بیوروکریٹس اور دُنیا پرستوں کی خاندانی چودھراہٹیں اور لادینیت پسند سیاسی جماعتیں راضی نہیں، نیز قادیانی اور عیسائی اور اسماعیلی اور کمیونسٹ مخالف ہیں۔ مسلم عوام کی اکثریت کی تو پروا ہی نہیں، کیونکہ ان کا تو آزادی اور شہریت کا مرتبہ اور انسانی حقوق حتیٰ کہ ضمیر کے مطابق شعور سے رائے دہی کا موقع وغیرہ وہ ساری نعمتیں نہیں ملیں جو خود لادین جمہوریت بھی دیتی ہے۔ (ن ۔ ص)

۱۹۷۳ء کے دستور میں اسے باقاعدہ آئینی حیثیت بھی دی گئی۔ جس کے بعد فرقہ وارانہ اختلافات کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے طے ہوجانا چاہیے۔ اور اب از سرِ نو اس مسئلہ کو اٹھانا، ایک طے شدہ بات کو بلاوجہ پیچیدہ بنانے کے مترادف ہے۔

آخر میں ہم محترم وزیرِاعظم کی خدمت میں یہ دردمندانہ گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں شریعت کا نفاذ اس ملک کی حیات و بقاء کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی جسم کے زندہ رہنے کے لیے اس میں روح کا وجود ضروری ہوتا ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم سب مسلمان ہیں، اور ہم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرض عاید ہے کہ ہم اس کے احکام کو اس کی سرزمین پر نافذ کریں، اس لیے بھی ضروری ہے کہ پاکستان کا مقصدِ وجود ہی یہ تھا کہ اس خطے میں مسلمان اپنے دین کو عملاً برپا کریں۔ اس لیے بھی ضروری ہے کہ موجودہ حکومت کی وجۂ جواز اسلام کے نفاذ کے سوا کچھ اور نہیں، اور وہ انہی وعدوں کے ساتھ برسرِ اقتدار آئی ہے کہ وہ اپنے اقتدار کے زمانے میں نفاذِ اسلام کا فریضہ انجام دے گی۔

لہٰذا موجودہ حکومت پر پچھلی تمام حکومتوں سے زیادہ یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنا یہ فریضہ اخلاص اور تن دہی کے ساتھ انجام دیں۔ اقتدار نے کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ یہ سایہ کسی بھی وقت ڈھل سکتا ہے۔ لیکن اقتدار کے سائے میں انجام دیئے ہوئے اچھے برے کام صرف تاریخ ہی میں محفوظ نہیں ہوتے، بلکہ اس جہان میں بھی ریکارڈ ہوجاتے ہیں جہاں ہر انسان کو اپنے ہر عمل کا حساب دینا ہے۔

خدا کرے کہ اس حقیقتِ عظمیٰ کے استحضار کے ساتھ ہم سب کے دل میں مخلوق کے بجائے اپنے خالق کو راضی کرنے اور اسی کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر پیدا ہوجائے تو ہمارے تمام مسائل حل ہوجائیں۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ۔ آمین

اسلام کا فلسفۂ اخلاق

مولانا محمد فاروق خان - ایم - اے - انڈیا

(۲)

اِس میں شبہ نہیں کہ مادی تصورِ حیات انیسویں صدی عیسوی میں یورپ میں اپنے شباب پر تھا - لیکن بیسویں صدی میں خود یورپ کے کتنے ہی مفکروں اور سائنسدانوں کو نئے انکشافات اور تحقیقات کے بعد اپنے نظریہ میں تبدیلی کرنی پڑی ہے - جے - ایس - ہالڈین (J.S. HALDANE) نے لکھا کہ زندگی کے مسئلہ کو طبیعاتی اور کیمیاوی مسئلہ سمجھنا غلط ہے زندگی اور انسان کی ذات (PERSONALITY) کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات کی محض مادی تعبیر ممکن نہیں [1]

سائنس نے اب ہمیں ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں بڑے بڑے سائنسدان یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ کائنات میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ شے (THING) سرے سے ہے ہی نہیں، بلکہ صرف عمل (ACTION) ہے یا وقوعات (EVENTS) کی عبارت ہے [2] - اس سے اس بات کو مزید تقویت پہنچتی ہے کہ یہ کائنات اندھے بہرے مادہ کی تخلیق نہیں، بلکہ اس کا منبعِ وجود کوئی ذہن و ارادہ ہے - دوسرے الفاظ میں کائنات خلقِ رب کا مظہر ہے - انسان کا

---

[1] PROF-J-S-HALDANE IN THE PHILOSOPHICAL BASIS OF BIOLOGY

[2] QUATED BY IQBAL IN HIS LECTURES

فرض ہے کہ وہ اپنے ارادہ اختیار کی دنیا میں اپنے رب کی اطاعت کرے۔
قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (ھود-۵۶)

"بے شک میرا رب سیدھے راستے پر ہے"۔

مطلب یہ ہے کہ خدا کا کوئی کام عدل، حکمت اور حق کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اس نے حق اور خیر کے تحت کائنات کی تخلیق کی ہے۔ ہمارے ارادہ و اختیار سے بھی جو چیز مطلوب ہے وہ حق و صداقت کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ انسان کی فلاح اور اس کی کامیابی کا اصل انحصار اس کے ظاہر اور باطن کی درستی پر ہے۔ ظاہر و باطن کو خَلق و خُلق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں: فلانٌ حسن الخَلق والخُلق "فلاں کا باطن بھی اچھا ہے اور ظاہر بھی"۔ ظاہر کو اگر ہم آنکھ سے دیکھتے ہیں تو باطن یا رُوح کا ادراک بصیرت کے ذریعے ہوتا ہے۔ ظاہر ہو یا باطن ہر ایک اپنی ایک مخصوص ہیئت و صورت پر قائم ہوتا ہے۔ یہ صورت و ہیئت اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بُری بھی۔ خلق یا نفس کی ہیئتِ راسخہ ہی ہے جس سے اعمال و افعال کا صدور ہوتا ہے۔ اگر ہم سے اچھے اعمال صادر ہوتے ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہمارا باطن بہتر ہے۔ اسی کو خُلقِ حَسَن سے تعبیر کرتے ہیں۔ آدمی کے رجحانات، مزاج اور ذوق سے اس کی باطنی صورت و ہیئت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی کے ذوق اور رجحان کو اس کے اخلاق و کردار سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ رسکن (RASKIN) نے غلط نہیں کہا ہے کہ ذوقِ حقیقت میں اخلاق کا کوئی جزو یا حصہ نہیں، بلکہ ذوق ہی اصل اخلاق ہے۔ کسی کو جانچنے کے لیے پہلا اور آخری سوال جو اس سے کر سکتے ہیں وہ یہی کہ اُسے کیا پسند ہے؟ آدمی کی پسند اور ناپسند اس کی غماز ہوتی ہے کہ خود وہ آدمی کیا ہے۔

اخلاقیات کے مطالعہ میں حق، حسن اور خیر (TRUTH BEAUTY AND GOODNESS) کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ ان کا تعلق اصل میں ہمارے علم و احساس اور عمل سے ہے۔ اگر آدمی حق و صداقت کے دریافت کرنے میں ناکام رہا تو حقیقت میں وہ صحیح علم (TRUE KNOWLEDGE) سے محروم رہا۔ اس کی زندگی اگر ایک جمالیاتی تجربہ

میں ڈھل نہ سکی تو اس کی احساسی (FEELING) دُنیا ویران ہی رہی - اسی طرح اگر وہ "خیر" کو سمجھنے میں کامیابی حاصل نہ کر سکا تو عملی لحاظ سے وہ یکسر خاسر قرار پائے گا۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ جاننا چاہتا ہے کہ حق و صداقت (REALITY) کیا ہے؟ وہ ان چیزوں کو اہمیت دیتا ہے جو حسن و خوبی کی حامل ہوں - اسی طرح وہ اس عمل کو اختیار کرنا چاہتا ہے جس میں خیر کا پہلو شامل ہو۔ عام مطالعہ میں صرف انسانی اعمال کا مطالعہ ہی اخلاقیات کے تحت کیا جاتا ہے - حق و صداقت کے حصول کو فلسفہ کا موضوع قرار دیا گیا ہے اور حُسنِ اخلاق کو جمالیات کا موضوع سمجھا جاتا ہے ، لیکن زندگی کی ان تینوں قدروں میں اتنا گہرا تعلق ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا - مثال کے طور پر نیک عمل کو علم سے الگ نہیں کر سکتے - جو عمل صحیح علم کے مطابق نہ ہو وہ ضلالت ہے - سقراط نے کہا ہے:

VIRTUE IS A KIND OF KNOWLEDGE

" نیکی علم ہی کی ایک قسم ہے "

سقراط کی مُراد یہ ہے کہ اخلاقی فرائض کے نتائج اگر ہم پر پورے طور پر واضح ہوں تو لازماً ہم اُن سے بے اعتنائی اختیار نہیں کر سکتے - غلط طرزِ عمل خود اپنے خلاف ایک سعیِ نامشکور ہے - اپنے خلاف کوئی اقدام کر کے کوئی اپنے تحفظ کا فریضہ کیونکر انجام دے سکتا ہے -

اخلاقیات سے جمالیات کو بھی الگ نہیں کر سکتے - ارسطو کے نظریہ کی رُو سے اخلاقی زندگی خود اس کے اپنے جمالیاتی اوصاف کی بنا پر قابلِ قبول ہوتی ہے -

ONLY BEAUTY IS GOOD

"حُسن و جمال کی حامل شے ہی خیر ہے"۔

حُسن و جمال کا تعلق محض جسم ہی سے نہیں ہے - اخلاقی لحاظ سے بھی بعض چیزیں جمالیاتی (MORALLY EXCELLENT) ہوتی ہیں - کانٹ (KANT) کے الفاظ میں وہ ہیرے کی طرح خود اپنی روشنی سے چمک رہی ہوتی ہیں - وہ اس شے کی طرح ہوتی ہیں جس کی قدر و قیمت خود اس کے اپنے وجود سے قائم ہوتی ہے -

خوشی (PLEASURE) کا بھی اخلاق سے گہرا رشتہ ہوتا ہے - صحیح اخلاقی طرزِ عمل سے سچی شادمانی حاصل ہوتی ہے - یہ شادمانی محض روحانی نہیں ہوتی، بلکہ ذہنی، قلبی اور جمالیاتی بھی ہوتی ہے - اس لیے کہا گیا ہے:

VIRTUE IS ITS OWN REWARD AND VICE IS ITS OWN PUNISHMENT.

"نیکی بذاتِ خود اپنی جزا اور بدی بذاتِ خود اپنی سزا ہوتی ہے۔"

اخلاق ہی کے ذریعے سے آدمی کی تکمیل ممکن ہوتی ہے - کمال کا حصول اخلاق کے بغیر ناممکن ہے - یہ اور اس طرح کے جن خیالات کا اظہار مفکر شخصیتوں نے کیا ہے ان کے ذریعے سے درحقیقت زندگی ہی کے مختلف پہلوؤں اور قدروں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے - اخلاق کے ذریعہ سے زندگی کی تشکیل ہوتی ہے - اخلاق زندگی کو ایک فورم (FORM) دیتا ہے - اخلاقی قدروں کا لحاظ زندگی کے تمام گوشوں میں مطلوب ہے۔

اخلاقیات میں فلاسفروں نے اپنا اولین فرض یہ سمجھا ہے کہ وہ زندگی کا حقیقی منتہا و مقصود دریافت کریں - افلاطون ارسطو سے لے کر اسپونزا (SPINONA)، کانٹ، ہیگل اور گرین (GREEN) تک سبھی نے یہ فرض انجام دینے کی کوشش کی ہے - منتہا و مقصود کی تعیین کے بعد انسان کی ذمہ داری خود بخود متعین ہو جاتی ہے اور اس کا وجوب اپنے آپ ثابت ہو جاتا ہے - اسی منتہا و مقصود کے پس منظر میں انسان کی پوری زندگی اپنا ایک فورم اور شکل اختیار کر لیتی ہے - مفکروں کو ان کی کاوش نے اس مقام تک پہنچا دیا ہے کہ وہ یہ ماننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ زندگی کے مقصود و منتہا (ULTIMATE END) کا انسان کی موجودہ حیات سے اتنا قریبی رشتہ ہے کہ موجودہ حیات و وجود کو اس سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا زندگی اسی میں داخل و شامل ہے - اخلاق کے فلاسفروں کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو اس حد تک واضح اور لوگوں کی نگاہوں میں اسے اس درجہ عریاں کر دیں کہ عام انسانی شعور اُسے اپنی گرفت میں لے سکے۔

جہاں تک ضابطہ یا قانون کا مسئلہ ہے تو اس کے بارے میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ

اخلاق و کردار جب بلند ہو جاتا ہے تو اخلاقی قوانین اور اُصول انسان کے لیے اجنبی نہیں رہتے، بلکہ وہ اس کے اپنے ہی شعور و احساس کی مرئی صورت ثابت ہوتے ہیں۔ آدمی جس چیز کو اپنے دل کی گہرائی میں پا رہا ہو اس کے اختیار کرنے کے لیے کسی خارجی قانون اور ضابطہ کے دباؤ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ایسے قانون اور اُصولوں کی پاسداری کا مطالبہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آدمی خود اپنے تئیں خیانت نہ کرے۔ وہ خود اپنے لیے سچا ہو:

TO THINE YOURSELF BE TRUE

"تم اپنے تئیں سچے بنو"

اخلاقی اُصولوں کی خلاف ورزی خود اپنی مخالفت ہے۔

انسانی معاشرہ سے انسان کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ وہ اپنے سماج کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ مختلف نفوس و افراد سے مل کر سماج کی تشکیل ہوتی ہے۔ مثالی شخصیت کا کامل اظہار معاشرہ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اس لیے سماجی ذمہ داریوں کو انسانی اخلاق سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اخلاق کا اعلیٰ اور کامل تصور وہی ہے جس میں فرد کی بہبود اور اجتماعی لحاظ سے نوعِ انسانی کی فلاح کا راز پوشیدہ ہو، جس سے مشکلیں آسان ہوتی ہوں۔ اُلجھے ہوئے مسائل کا خاتمہ ہوتا ہو، اور ہمارے دل و دماغ کو سکون و راحت حاصل ہوتی ہو اور جس کے ذریعے سے دُنیا ظلم و فساد سے پاک ہو سکتی ہو۔ برفو (BRIFFAUTT) کا ذہن اس طرف گیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

> "مثالی اخلاقیات کی کیسی ہی عظیم الشان عمارت آپ تعمیر کریں۔ اگر باطل کو مٹا کر اس کی جگہ حق کو قائم کرنے سے قاصر ہے تو وہ بے معنی چیز ہے۔ اس اُوپری عمارت کو اخلاقیات کی عمارت نہیں کہا جا سکتا۔"[1]

اخلاق کی اہمیت اور اس کے مختلف پہلوؤں کے تذکرہ کے بعد یہ سوال باقی رہتا ہے کہ انسان اخلاقی نظام فکر و عمل کے لیے ایسے واضح ضوابط اور قوانین کہاں سے اخذ کرے جو

---

[1] THE MAKING OF HUMANITY

سب کے لیے واجب الاطاعت ہوں، جس کے صحیح اور اعلیٰ نظامِ اخلاق ہونے میں کسی کو شبہ نہ ہو سکے ؟ انسانی علوم میں باضابطگی واضح ضابطہ کے بغیر ممکن نہیں اور نہ اس کے بغیر انسانی فکر کو انتشار و تلون سے بچایا جا سکتا ہے۔

اِس سوال کا صحیح جواب صرف مذہب کے پاس ہے ۔ انسانی فکر کے سامنے اخلاق کے فطری تقاضے تو اُبھر سکتے ہیں، لیکن مذہب کے تعاون کے بغیر مکمل اور قابلِ اعتماد ضابطۂ اخلاق ترتیب دینے سے وہ یکسر قاصر ہے ۔ مذہب کے علاوہ دوسرے ذرائع خواہ وہ نفسیات و وجدان ہو یا تجربات و احساسات اصل ماخذ کے صرف مددگار ہو سکتے ہیں ۔ اصل ماخذ کی حیثیت ان کو حاصل نہیں ہو سکتی ۔ محض جزوی صداقتوں کے علم سے ایک اعلیٰ اور محکم اخلاق کی تشکیل کیوں کر ممکن ہو سکتی ہے ۔ ایک قطعی اور واجب الاطاعت قانون کی ضرورت کا احساس تو کانٹ کو بھی ہوا ہے ، لیکن وہ اس کی کوئی واضح تشریح کرنے میں ناکام نظر آتا ہے ۔

اخلاق کے سلسلے میں خیر و شر کے صحیح تصور کا سوال سامنے آتا ہے، لیکن اس کے حل کرنے میں ہمارا تجرباتی اور وجدانی علم ناکافی ثابت ہوتا ہے ۔ عقل اس معاملہ میں دُور تک ہمارا ساتھ نہیں دیتی ۔ اخلاق کی پشت بان قوت اور داعیات و محرکات کے بارے میں انسانی فکر نے جو چیزیں تجویز کی ہیں، ان کی نفی نہیں کی جا سکتی ۔ لیکن مذہب کی رہنمائی نہ ہو تو ان چیزوں کی حیثیت واضح نہیں ہوتی اور نہ انہیں کوئی محکم بنیاد میسر آتی ہے ۔

(باقی)

اسلام میں اختلاف کے آداب

حصّہ دوم

قرونِ خیر کے بعد اختلاف (۳)

ترجمہ وتلخیص جناب عبدالحی ابڑو صاحب - اسلامی یونیورسٹی - اسلام آباد

عہدِ حاضر میں اختلاف کے آداب یہ بات مسلّم ہے کہ زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ اسبابِ اختلاف بھی بدلتے رہتے ہیں۔ مگر گذشتہ عہد کے کچھ نہ کچھ اسباب نئے عہد کی طرف ضرور منتقل ہوتے ہیں۔ عہدِ حاضر میں مسلمانوں کے اندر پائے جانے والے اختلاف کا نمایاں اور بنیادی سبب اسلام کے متعلق ان کی ناواقفیت وجہالت یا اس کے بارے میں ناقص علم کو قرار دیا جاسکتا ہے۔

بلادِ اسلامیہ میں کافرانہ استعمار کے داخلے سے پہلے کے علمی ماحول کا ذکر تو آپ پڑھ چکے ہیں آئندہ سطور میں ہم استعماری قوتوں کے غلبہ کے بعد کے ان حالات کا جائزہ پیش کریں گے جس کے نتیجہ میں اس صورتِ حال میں مزید ابتری پیدا ہوئی - استعماری طاقتیں یہ جان چکی تھیں کہ مسلمانوں کی فضیلت وعظمت کا راز کس چیز میں پنہاں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی توجہ مسلمانوں کے نصابِ تعلیم اور ایسے اداروں کے قیام پر مرکوز کردی جن کے ذریعہ سے ان کی عقل اور اندازِ فکر پر اثر انداز ہوکر انہیں نئی صورتِ حال اور نئے عالمی نظریات کو قبول کرنے اور ان کے مطابق ڈھل جانے کے لیے تیار کرسکیں۔

انہوں نے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی پوری کوشش کی کہ مسلمان اس نئی صورتِ حال کو قبول

کرکے ترقی و کمال کی منازل طے کرسکتے ہیں جس طرح مغربی ممالک میں ہوا کہ تہذیب و تمدن کی شاہراہ پر انھوں نے اس وقت قدم رکھا جب مذہبی احکام سے بغاوت و سرکشی کی راہ اپنا کر کلیسا کی پابندیوں سے خود کو مکمل طور پر آزاد کر لیا۔ اُن کے خیال کے مطابق ہر مذہب متوقع ترقی و خوشحالی کی راہ میں انسانی پیش رفت کے لیے ایک زبردست رکاوٹ ہے۔ کَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا " (الکہف ۱۸:۵) بڑی بات ہے جو اُن کے منہ سے نکلتی ہے، وہ محض جھوٹ بکتے ہیں"۔

ان کا یہ دعواے دیگر تحریف شدہ مذاہب کے بارے میں تو درست ہوسکتا ہے، لیکن اسلام کے بارے میں ایسا دعویٰ یقیناً غلط اور غیر حقیقت پسندانہ ہے، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی سعادت و خوشحالی وابستہ کر رکھی ہے۔ انسانیت اس نورِ خداوندی کی روشنی میں اپنی ساری اُمیدوں اور اُمنگوں کی تکمیل کرسکتی ہے۔

اُمتِ مسلمہ کا شیرازہ بکھیرنے اور اس کے اسلامی تشخص کو ختم کرنے کے لیے کافرانہ استعمار نے اسلامی تعلیم اور اس کے ذریعہ تعلیم یعنی عربی زبان کے لیے طرح طرح مشکلات اور رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے دیگر وسائل اپنانے کے ساتھ ساتھ ان طلبہ کے سامنے بھی بے توجہی برتی جانے لگی۔ جنھیں دیگر طریقوں سے اسلامی تعلیم کی راہ سے ہٹانا اُن کے لیے مشکل تھا۔ ان کے بارے میں ایسے خیالات و افکار پھیلائے گئے جن سے ان کے مقام و مرتبہ کو دھچکا لگا۔ ان کی حیثیت گھٹی اور یہ علوم و فنون بے وقعت ہوکر رہ گئے۔ نتیجتاً معمولی درجے کے عہدوں اور مناصب سے بھی وہ محروم کر دیے گئے۔ اس کے مقابلے میں ایسے طلبہ پر خصوصی توجہ دی گئی جو جدید طرز کی درسگاہوں سے منسلک ہوکر وہاں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اس سلسلہ میں انھیں ہر طرح کی سہولتیں فراہم کی گئیں اور ان کے لیے روشن مستقبل کے دروازے کھول دیے گئے۔ تاکہ اُمتِ مسلمہ کی قیادت و حکمرانی کے مناصب انھیں کے لیے مخصوص ہوسکیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی تعلیم اور عربی زبان سیکھنے والے طلبہ کی تعداد محدود ہو کر رہ گئی۔ ان تمام مشکلات کے باوجود معدودے چند طالب علم اگر ادھر کا رُخ کرتے بھی تو انھیں عام طور پر ایسی سختیوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تو

وہ دل برداشتہ ہو کر اوّل تو یہ راستہ ہی چھوڑ دیتے، لیکن اگر کوئی جرأت کر کے آگے بڑھنا بھی چاہتا تو اس کے اور دوسروں کے درمیان مختلف عہدوں، ملازمتوں اور بڑے بڑے مناصب میں کئی قسم کے امتیازات برتے جاتے، جنہیں دیکھ کر انہیں ظلم و ناانصافی اور اپنی بے بسی کا شدید احساس ہوتا۔ یہ صورتِ حال اب تک جوں کی توں برقرار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر اسلامی ممالک میں اسلامی تعلیم کا معیار بہت گر گیا ہے۔ طالب علموں کی انتہائی قلیل و ضئیل تعداد اس طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اور وہ بھی یہ جانتے ہوئے اس میدان میں اُترتے ہیں کہ وہ جو کچھ کاشت کر رہے ہیں اس کا کاٹنا شاید ان کے مقدر میں نہ ہو۔ بہر حال ان تمام رکاوٹوں کے باوجود جو لوگ اس طرف متوجہ ہوتے ہیں تکمیلِ علوم کے بعد عملی زندگی میں انہیں پھر شاید مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چونکہ ان پر معاشرہ میں فعّال کردار ادا کرنے کے تمام دروازے بند کر دیے گئے ہیں لہٰذا وہ دعوتِ دین کا کام اور معاشرے کی اصلاح کے سلسلے میں اپنا فرض پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ ان بند دروازوں کے سامنے ان کا استقلال اور ثابت قدمی جواب دینے اور ان کی شخصیت کمزور پڑنے لگتی ہے اور وہ ایسے سرکاری مذہبی اداروں سے وابستہ ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو پہلے ہی سے چند لگے بندھے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ جن سے ہٹ کر کوئی بھی کام کرنا ان کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس طرح معاشرے میں جب وہ اپنا کردار ادا نہیں کر پاتے تو عام مسلمانوں کا ان پر سے اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔

اُمتِ مسلمہ کو اپنے عقائد سے برگشتہ کرنے اور ان کی شریعت سے وابستگی کو کمزور کرنے کے لیے کافرانہ استعمار نے عربی زبان اور اسلامی تعلیم کو ذیلی حیثیت دے کر اور اپنے پسندیدہ افکار و نظریات کے لیے میدان ہموار کر کے نوجوانانِ ملت کے لیے اسے بے حد پُرکشش بنا دیا، مگر انہیں وہاں سے کانٹوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ملا۔ مسلمانوں کی نوجوان نسل نے کمیونزم، سوشلزم، قومیت اور اس طرح کی دیگر تحریکوں کو جنہیں ان کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کیا گیا تھا اور جن تحریکوں اور نظریات نے اُمت کو پہلے سے زیادہ ذلت و رسوائی میں مبتلا کر دیا تھا، آزما لینے کے بعد بخوبی جان لیا کہ اسلام ہی اس اُمت کے تمام

مسائل و مشکلات کا واحد حل ہے۔ صرف وہی انہیں قعر مذلت سے نکال سکتا ہے اور امت کی پسماندگی کے اسباب کو دور کر سکتا ہے۔ یہ بات بڑی خوش آئند تھی کہ ہمارے نوجوانوں میں مختلف راہوں میں بھٹکنے کے بعد اسلام کی طرف رخ کرنے کا شعور بیدار ہوا اور انہیں اپنے دین و ایمان اور وجود کو لاحق خطرات کا احساس ہونے لگا۔

اس سلسلہ میں انہیں دینی بصیرت پیدا کرنے اور شرعی احکام و مسائل جاننے کے ضمن میں پھر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چونکہ ان کے سامنے کوئی مربوط تعلیمی نظام نہیں تھا جو اس سلسلہ میں ان کی رہنمائی کرتا، لہٰذا انہیں جو بھی کتابیں دستیاب ہوسکیں انہوں نے بطور خود ان سے استفادہ کی کوشش کی۔ دوسری طرف انہیں ایسے باصلاحیت اساتذہ بھی میسر نہ آسکے جو ان کی مناسب رہنمائی کر سکتے، چنانچہ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہ کتابیں پڑھ کر اسلام کو انہوں نے ان کتابوں کے تناظر میں دیکھا۔ اور اس طرح اسلام کا ایک محدود گوشہ تو ان کے سامنے آیا، مگر اسلام سے وہ کلی طور پر متعارف نہ ہوسکے اور ان کی نگاہوں سے اس کے اصول و مقاصد اوجھل رہے۔ ان کی مثال ان اندھوں کی سی ہوگئی جو کسی ہاتھی کو اپنے ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھنا چاہتے تھے — جس کا ہاتھ جہاں پہنچا اس نے اس حصے کو مکمل ہاتھی سمجھ لیا۔ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا معاملہ انہی اندھوں والا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اسے اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق سمجھنے کے لیے کوشاں ہے۔ اس چیز نے انہیں مختلف جماعتوں اور چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بانٹ دیا ہے۔ ان لوگوں کی تو بات ہی کیا جو اسلام سے منہ موڑ کر اپنی خواہشاتِ نفسانی کے گھوڑے پر سوار اندھا دھند بھاگے جا رہے ہیں اور جس کا رخ کبھی وہ مشرق کی طرف موڑ دیتے ہیں اور کبھی مغرب کی طرف، جب کہ اسلام سے ان کا رشتہ بس ان اسلامی ناموں کی حد تک محدود ہے جو انہیں موروثی طور پر ملے ہیں۔ اگر ذرا سی بھی شرم و حیا باقی نہ رہ جاتی تو وہ ان سے بھی جان چھڑوا لیتے۔ البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اسلام کے سایہ دار درخت کی جانب لوٹنا چاہتے ہیں۔ لیکن صحیح رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے لیے وہ مختلف راہیں اختیار کرنے پر مجبور ہیں اور اس طرح ان میں اختلاف واقع ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ خود ان میں پھوٹ پڑتی

ہے بلکہ ان کے دشمنوں کو اُن پر غلبہ حاصل کرنے میں دشواری پیش نہیں آتی اور حکمرانوں کی لاٹھی بھی ان کا ہر جگہ پیچھا کرتی رہتی ہے۔

راہِ نجات اس اُمت کے مرض کی تشخیص کے بعد مندرجہ ذیل سطور میں ان کے علاج کی مختلف صورتوں کا سرسری جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ جو مخلص مسلم میدانِ دعوت و تبلیغ میں سرگرم عمل ہیں اور جنہیں اُمت کے اس المیہ سے سروکار ہے انہیں چاہیے کہ چند ذہین و فطین مسلم نوجوانوں کے ایک گروہ کا انتخاب کر کے علومِ شریعت کی تدریس کے لیے انہیں بہتر مواقع مہیا کریں اور ایسے باقی ماندہ علمائے شریعت کے زیر سایہ ان کی تربیت و تعلیم کا اہتمام کریں، جو علم و عمل، طہارت و تقویٰ، صحیح فکر و نظر، اسلام کے مفاد و اہداف کے ادراک اور علومِ اسلامیہ میں گہری بصیرت و تفقہ کے جامع ہوں اور ان کی عملی زندگی میں بھی ایک قابلِ تقلید نمونہ ہو۔ اس تربیت و تعلیم میں نبوی طریقِ کار ان کے لیے مشعلِ راہ ہونا چاہیے۔ نوجوانوں کے اس گروہ کو چند ایسے دوسرے نوجوانوں کے ذریعے تقویت پہنچائی جائے جو مختلف عصری علوم کے ماہر ہوں اور جو اخلاص و تقویٰ کے مرتبے پر بھی فائز ہوں۔ دونوں طرح کے یہ نوجوان مل کر سفر کا صحیح رُخ متعین کر سکتے ہیں اور اسلامی بیداری کی موجودہ لہر کی رہنمائی کر کے اُسے انحراف سے بچا سکتے ہیں، جس کے بعد اُمت کے لیے عافیت و چھٹکارے کا سامان ہو سکے گا۔ اور روز بروز تباہی کے گڑھے کی طرف بڑھنے والی انسانیت اس کی قیادت میں اپنا صحیح رُخ متعین کر سکے گی اور ظاہر ہے کہ اس کی نجات اسلام ہی میں مضمر ہے۔

۲۔ مسلمانوں کے فکری سفر اور سوچ میں اس طرح سے تبدیلی لائی جائے کہ اس سے اس فکری بحران کا علاج ہو سکے جس سے مسلمان آج کل دوچار ہیں۔ اور جس کے دُور رس اثرات و نتائج کا شعور کم ہی لوگوں کو ہے۔ یہ بحران مسلم اداروں کے زوال و انحطاط، مسلم تنظیموں کے فقدان، مسلم نوجوانوں کے ہاں علم و آگہی اور تربیت و تعلیم کے گرتے ہوئے معیار، باہمی تعلقات میں پھوٹ آنے، اور صالح گروہوں کی قابلِ قدر کوششوں کو ناکام بنانے کی تدبیروں سے عیاں ہو جاتا ہے۔ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی تعلیمات

کو میدانِ زندگی سے دوچار کیا جا چکا ہے۔ اسلام کے مثالی افکار و نظریات اور انسانیت کے درمیان خلیج گہری ہو چکی ہے۔ اسلام کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ یہ ایک ایسا بادل ہے جو نہ تو برستا ہے اور نہ ہی مُردہ زمین میں زندگی کی نئی رُوح پھونک سکتا ہے۔ یا پھر اس کی مثال چکنے پتھر پر پڑنے والے پانی کی ہے جو کوئی کھیتی اُگاتا ہے نہ کوئی سبزہ۔ کیونکہ دل سخت ہو چکے ہیں اور انہیں زنگ لگ چکا ہے اور آنکھیں خیرہ ہو چکی ہیں، جن کے اندر خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔

مختلف تعلیمی ادارے اُمت کو معتدل مسلمان انسان دینے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ مسلم ممالک میں مغربی طرز پر جو یونیورسٹیاں قائم ہیں وہ اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتیں کہ تمام شعبہ ہائے علوم میں ایسا ماہر مسلمان تیار کرنا ہے جو تمام علوم و معارف کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی قدرت رکھتا ہو، بلکہ اُن کا مطمحِ نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ ایسے طلبہ تیار کیے جائیں کہ جو مغربی علوم و فنون کے دلدادہ ہوں۔ اور جلد ہی اسلامی عقائد اور اسلامی نقطۂ نظر سے زندگی کے مقاصد و اہداف سے قطع تعلق کر لیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان یونیورسٹیوں سے ایسی نسل نکلی جس کا اُمت سے تعلق و رابطہ کمزور، تعلقات پیچیدہ اور سوچ اُلجھی ہوئی ہے۔ اپنے علم کو اُمت کی ضرورت کے لیے استعمال کرنا ان کے بس میں نہیں ہے۔

دوسری طرف وہ تعلیمی ادارے جو شرعی و دینی مزاج رکھتے ہیں جیسے جامعہ الازہر اور اس جیسی دیگر اسلامی جامعات یا کالج و مدارس وغیرہ۔ انہوں نے محدود پیمانے پر تو چند شرعی علوم میں کچھ ماہرین پیدا کیے ہیں، لیکن یہ ادارے ایسے مستند علماء پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں جو اُمت کی عملی اور فکری قیادت اور دین کی تجدید کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے اسلام کو اس کے اصولوں اور اہداف و مقاصد کی روشنی میں اُمت کے سامنے پیش کر سکیں اور موجودہ دور کے چیلنجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ان پر غلبہ پا سکیں۔ اس بنا پر اسلامی فکر کا دائرہ تنگ ہوتا گیا۔ اور مسلمانوں کی زندگی اور اندازِ فکر پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی عقلیں تمام غیر اسلامی افکار و نظریات کو بھی قبول کرنے لگیں۔ اور مسلمان سیاست، معیشت اور معاشرت وغیرہ میں اپنے مسائل حل کرنے سے عاجز رہے

اور دوسروں کی اُلٹی سیدھی نقلیں کرنے لگے۔ فرزندانِ اُمت کی باہمی رسّہ کشیوں نے اُمت کی اقدار وروایات اور اُصولوں کے بندھنوں کو توڑ ڈالا۔ یہ باہمی تصادم عام طور پر مغرب سے متاثر اور اس کی ثقافت کے فریفتہ گروہ کے حق میں مفید ہوتا ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ یہ مومن ہراول دستہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے اور چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے خود ہی جھگڑوں اور اختلافی مسائل کا شکار ہو گیا۔ کیونکہ اکثر مسلمانوں کے ذہن میں جزئیات وکلیات اور مقاصد ومبادی باہم گڈمڈ ہو گئے ہیں۔

ہمیں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ کتاب وسنّت کی روشنی میں اسلام کی رُوح، اس کے مقاصد وقواعد کلیہ اور مسائل واحکام کے مراتب کے شعور وادراک کی بنیاد پر قائم کردہ صحیح اسلامی سوچ پیدا کریں۔ قرونِ خیر میں سلفِ صالحین کتاب وسنّت سے جس طرح استفادہ کرتے تھے اس اسلوب کو سمجھنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کے ذریعے اُمت کے مسائل کو اسلام کے تصورات اور اس کے پیش کردہ حل کے مطابق نمٹا سکیں اور افرادِ اُمت کو اس بات کا پورا پورا یقین حاصل ہو سکے کہ اسلام ہی راہ نجات اور تمام مشکلات کا واحد حل ہے۔ یہی یقین اُمتِ مسلمہ کو اسلام کی فکری بنیادوں کے ساتھ شعور وبصیرت کے ساتھ اس طرح سے ربط گہرا کرنے پر مجبور کر دے گا کہ اس کے بعد شیطان اُسے کاٹ کر علیحدہ نہیں کر سکتا۔ اُمتِ مسلمہ جب خوابِ غفلت سے بیدار ہو گی اور مرض کی صحیح تشخیص کر لے گی تو ایسے طریقے اسے خود بخود نظر آئیں گے (اور انہیں اختیار کیے بغیر ان کے لیے کوئی چارۂ کار نہ ہو گا) جن کے ذریعے اس کے مرض کا علاج ہو سکے اور وہ اُسے اپنے مقصد تک پہنچا سکیں۔ انشاء اللہ وہ دن دُور نہیں۔

مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ اسلامی اخوت واتحاد کی حفاظت، اور اس کو کمزور کرنے اور نقصان پہنچانے والی چیزوں کو راستے سے ہٹانا مسلمانوں کا سب سے اہم فریضہ اور سب سے بڑی عبادت ہے کیونکہ اسی اخوت کے ذریعے ہی ہم ان ساری مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں، جو اسلامی نشاۃ ثانیہ کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہیں ___ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تفرقہ اندازی کو سخت ناپسند فرماتے ہوئے اس سے دُور

رہنے کی تلقین فرمائی ہے اور مسلمانوں کی جماعت کے اندر نفاق و افتراق پیدا کرنے والے کا خون مباح قرار دیا ہے۔ اس لیے محض اختلاف رائے کی وجہ سے اسلامی اخوت کے تقاضوں کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا یا اسے نقصان پہنچانا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ بالخصوص موجودہ حالات میں جب کہ کفر کی ساری قوتیں ہم سے نبرد آزما ہیں اور ان کی خواہش و کوشش ہے کہ ایمان کی بھڑکتی ہوئی چنگاری کو بجھا دیں۔

اخوت اور مسلمانوں سے محبت و اتحاد پہلا بنیادی فریضہ ہے جس کا حکم ہمیں خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے کیونکہ توحید سے اس کا قریبی تعلق ہے۔ اِسی طرح اخوتِ اسلامی کے خلاف کوئی قدم اُٹھانا بھی ممنوعات و منکرات میں سرفہرست ہیں۔ اسی لیے علمائے سلف اختلاف سے بچنے اور مسلمانوں کے باہمی ربط و تعلق کو برقرار رکھنے کی خاطر افضل کو چھوڑ کر مفضول پر عمل کر لیتے تھے اور جو امر ان کی نظر میں مستحب و مندوب ہوتا کبھی کبھی اُسے چھوڑ کر جائز ہی پر اکتفا کر لیتے۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"ایک دوسرے کی اقتدا میں نماز پڑھنے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے، جس طرح صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور ان کے بعد ائمہ اربعہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ اس کا منکر بدعتی، گمراہ، کتاب و سنّت اور اجماعِ اُمت کی خلاف ورزی کا مرتکب ہے۔ صحابہ و تابعین اور اُن کے بعد آنے والے حضرات میں سے کچھ بسم اللہ پڑھ کر (نماز میں قراءۃ کا) آغاز کرتے تھے اور کچھ ایسا نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے، جیسے امام ابوحنیفہؒ، ان کے رفقاء اور امام شافعیؒ وغیرہم، مدینہ کے مالکی ائمہ کی اقتدا میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ زور سے یا آہستہ بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔ امام ابویوسفؒ نے خلیفہ ہارون الرشید کے پیچھے نماز پڑھی جس نے پچھنا لگوا رکھا تھا۔ امام مالکؒ نے اسے وضو واجب نہ ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ امام ابویوسفؒ نے اس کے پیچھے نماز پڑھ لی اور اس کا) اعادہ نہیں کیا۔ امام احمد کے نزدیک نکسیر پھوٹنے اور پچھنا لگوانے سے وضو ٹوٹ

جاتا ہے۔ ان سے کسی نے پوچھا۔ اگر امام کے بدن سے خون نکل جائے اور وہ وضو نہ کرے تو کیا میں اُس کے پیچھے نماز پڑھ لوں ؟ آپ نے کہا : بھلا سعید بن المسیبؒ اور مالکؒ کے پیچھے بھی تم نماز نہیں پڑھو گے ؟"[1]

اسلامی اخوت اور اتحاد بین المسلمین کی تاکید کا یہ مطلب نہیں کہ بنیادی عقائد جن میں مسلمہ قواعد کے مطابق کسی تاویل کی گنجائش نہ ہو اس میں بھی سستی اور تغافل برتا جائے۔ اور دشمنانِ دین وملت سے برسرِ پیکار ہونے کے لیے اخوتِ اسلامی کو برقرار رکھنے کے شوق میں ہم اپنا ہاتھ ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دیں جو صرف نام کے مسلمان ہیں۔ اختلافی مسائل جن سے باہمی انتشار وافتراق نہیں ہونا چاہیے۔ بس وہی ہیں جنہیں ائمہ سلف نے مانا ہے۔ ان کے حدود آداب میں داخل رہے اور ان کے پاس مختلف وجوہ سے ایسے اختلاف کے جواز کے دلائل موجود تھے۔

اول وآخر سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ظاہری وباطنی ہر طرح انسان کو اپنے دل میں اللہ کی خشیت و تقویٰ کو جاگزیں کرنا چاہیے۔ اتفاق ہو یا اختلاف ہر حالت میں ہمیں اس کی خوشنودی اور رضامندی کا طلب گار ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ دینی بصیرت و تفقہ پیدا کرنا، نفسانیت سے کنارہ کشی، شیطانی وسوسوں سے ہمیشہ دور رہنا، ابلیس کی چالوں سے باخبر ہونا اور اس کی چال میں پھنسنے سے اجتناب بھی بہت ضروری ہے۔

---

[1] الفوائد العدیدۃ (شیخ منقور) : ۲/۱۸۱

بحث و نظر

حضرت یونسؑ اور واقعۂ حُوت

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ترجمان القرآن کے مطالعہ کنندگان میں ایسے بیدار دل اور تفکر پسند حضرات بھی موجود ہیں جو تحریروں کو یونہی سرسری نظر سے نہیں پڑھ جاتے، بلکہ غور بھی کرتے ہیں اور پھر جو بھی اُن کا ردِ عمل ہو اُسے اخلاص کے ساتھ صاف صاف سامنے لے آتے ہیں۔

آپ کا خط شائع کیا جا رہا ہے تاکہ دوسرے سوچنے اور لکھنے والوں کو بھی تحریک ہو۔ جو بھی دوسرا خط موصول ہُوا اُسے بھی شائع کر دیا جائے گا۔ اگر ضرورت ہوئی تو ادارے کی طرف سے بھی آخر میں وضاحت کر دی جائے گی (ا ف ص)

(ادارہ)

جنوری ۱۹۸۸ء کے شمارے میں سید شبیر محمد صاحب کا مضمون "حضرت یونسؑ اور واقعہ حوت" پڑھا۔ یہ واقعی ایک گراں قدر اور پُرتحقیق مضمون تھا، جس کے لیے مضمون اور آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

جنابِ گرامی جہاں یہ مضمون بہت سے خدشات و شبہات کا ازالہ کرتا ہے، وہاں چند نئی اُلجھنیں بھی پیدا کرتا ہے، جو قلب و ذہن میں اک خلش سی پیدا کرتے ہیں۔

جیسے کہ ہم جانتے ہیں کہ معجزہ کسی خارق العادت واقعہ کو کہتے ہیں جو کسی پیغمبر سے سرزد ہو۔ یعنی جس کی کوئی (POSSIBILITY) نہ ہو۔ اگر کوئی واقعہ یا اس کا ظہور ممکنات میں سے ہو، یعنی وہ (POSSIBLE) ہو تو وہ معجزہ نہیں کہلائے گا۔ (باقی بر صفحہ ۴۸)

اقتباس

حرام چیزوں سے بچیے

متحدہ عرب امارات کی حکومت نے پروفیسر احمد صقر (بیروت) کا ایک مقالہ شائع کیا ہے جس میں بڑی تحقیق کے بعد یورپ اور امریکہ کی اُن چیزوں کی فہرست دی گئی ہے جن میں خنزیر کے جسم کا کوئی نہ کوئی جزو ضرور شامل کیا جاتا ہے۔ ان اشیا میں صابن اور کریم کے علاوہ کھانے کی چیزیں مثلاً چاکلیٹ، بسکٹ، پنیر، ڈبل روٹی اور مشروبات بھی شامل ہیں۔ مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے کہ اس سلسلہ میں حسبِ ذیل الفاظ خاص طور پر نوٹ کریں۔ اور جن چیزوں پر بھی یہ لکھے ہوں سمجھ لیں کہ ان میں خنزیر کی چربی اور گوشت وغیرہ شامل ہیں۔ یہ چیزیں ہرگز استعمال نہ کریں اور جسے استعمال کرتا پائیں، اُس کے علم میں لائیں کہ یہ حرام ہیں۔ جس دکاندار کے پاس دیکھیں، اُس کی ایمانی حس سے اپیل کریں اور بتائیں کہ یہ چیزیں ہمارے دین میں حرام ہیں اور ان کا فروخت کرنا بھی حرام ہے۔

۱۔ پگ، ہاگ اور سوائن (SWINE، HOG، PIG) خنزیر کو کہتے ہیں۔

۲۔ پورک (PORK) سپورکل (SPORKLE) ہیم (HAM) بیکن (BECON) اور نمکین پورکر (PORKER) گوشت خنزیر ہی کے مختلف نام ہیں۔

۳۔ لارڈ (LARD) خنزیر کی چربی کو کہتے ہیں۔

۴۔ جیلیٹن یا جیلو (GELLO - GELATIN) ایک سیال ہے جس میں زیادہ تر جزو خنزیر کی کھال، ہڈیوں اور کھروں کا ہوتا ہے۔

۵۔ پیپسین (PEPSIN) ایک دوا ہے جس میں خنزیر کا خون شامل ہوتا ہے۔

۶ ــــ ایل شارٹننگ یا انیمل شارٹننگ ـــــ (L - SHORTENING)
یا (ANIMAL SHORTENING) ایک تیل ہے جس میں عام طور پہ کھانا پکایا جاتا ہے۔ اس میں زیادہ تر خنزیر کی چربی یا ایسے جانوروں کی چربی ہوتی ہے جن کا جھٹکا کر کے گوشت بنایا جاتا ہے۔

اشیائے خوردنی کی فہرست میں یہ اجزا شامل ہیں:

۱۔ پرنس چاکلیٹ (PRINCS CHOCOLATE)

۲۔ کریفٹ چیز (CRAFT CHEESE)

۳ ــ رے مارک چیز (RAMARK CHEESE)

اِن دونوں کمپنیوں کے بنے ہوئے پنیر، خنزیر کے دودھ پیتے بچے کے معدے سے بنائے جاتے ہیں۔

۴ ــ یورپ اور امریکہ میں بنے ہوئے زیادہ تر بسکٹ، پیسٹریاں اور روٹیاں خنزیر کی چربی سے تیار کی جاتی ہیں۔

۵ ــ پیپسی کولا مشروب میں پیپسین ملائی جاتی ہے۔

حسب ذیل استعمال کی چیزوں میں لارڈ یعنی خنزیر کی چربی شامل کی جاتی ہے:

LUX, CAMY, SOAP, AVERY SOAP, SAAP LATA SAIP GUARD ZICT, BRYL CREAM, LISCAP

بالوں کی کریم۔ یہ تمام چیزیں کولگیٹ (COLGATE) اور پام لیف (PALMLEAF) دو کمپنیوں کی بنی ہوتی ہیں۔ اسی طرح کولگیٹ اور (BURDEN FOOD) کے بنے ہوئے ٹوتھ پیسٹ میں بھی خنزیر کی چربی ہوتی ہے۔

سائنسی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ سوائے خنزیر کی چربی کے دیگر ہر جانور کی چربی انسانی جسم پر پگھل جاتی ہے، چنانچہ خنزیر کی چربی نسوانی لپ اسٹک میں ملائی جاتی ہے۔

تلخیص و اقتباس (از مقالہ پروفیسر احمد صقر (بیروت)، مرتبہ: ابوضیا اشرف - مطبوعہ اردو ڈائجسٹ لاہور)

رسائل ومسائل

اگر نمازِ فجر کی سنتیں چھوٹ جائیں؟

جناب مولانا غلام علی صاحب

سوال: فجر کی نمازِ جماعت کھڑی ہو چکی ہو اور آنے والا آدمی جماعت میں شامل ہو جائے تو فرض نمازِ فجر کے سلام پھیرنے کے بعد پیچھے آنے والا آدمی فوراً سورج طلوع ہونے سے پہلے سنتیں پڑھ سکتا ہے! یا نہیں؟

اگر طلوع سورج سے پہلے سنتیں پڑھ سکتا ہے تو اس مسئلے کی حدیث کا [illegible] پیش فرمائیں۔ حدیث کس کتاب کی ہے اس کتاب کا حوالہ نوٹ فرما [illegible] حدیث بھی نقل فرما دیں تو بہتر ہو گا۔

جواب: نمازِ فجر کی سنتیں اگر جماعت سے پہلے ادا نہ ہو سکیں، تو اُن کی ادائی کے لیے دونوں طرح کی احادیث مروی ہیں۔ صحاحِ ستہ میں یہ احادیث ترمذی اور سنن ابی داؤد میں موجود ہیں، جنہیں مشکوٰۃ میں بھی نقل کیا گیا ہے۔ احادیث درج ذیل ہیں:۔

عن سعد بن سعید عن محمد بن ابراھیم عن جدہ قیس قال: خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاقیمت الصلوٰۃ فصلیت معہ الصبح، ثم انصرف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فوجدنی اُصلی۔ فقال مھلاً یاقیس: أصلاتانِ معاً؟ قلت: یارسول اللہ، انی لم اکن رکعتُ رکعتی الفجر، قال، فلا اذن (سنن ترمذی، کتاب الصلوٰۃ ما جاء فیمن تفوتہ الرکعتان قبل الفجر یصلیھما بعد الفجر)۔

"محمد بن ابراہیم سعد کے دادا حضرت قیسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے، نماز کی اقامت ہوئی اور میں نے آنحضورؐ کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پلٹے تو مجھے دیکھا کہ میں نماز پڑھنے لگا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: قیس ٹھہرو، کیا ایک ساتھ دو نمازیں پڑھنے لگے ہو)؟ میں نے عرض کیا، اے، اللہ کے رسولؐ، میں نے فجر کی دو سنتیں نہیں پڑھی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا: تب کوئی حرج نہیں)۔

امام ترمذی اس کے بعد دوسرے ہی باب میں یہ حدیث لاتے ہیں:

عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من لم یصل رکعتی الفجر فلیصلھما بعد ما تطلع الشمس۔

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے فجر کی دو رکعت (سنت) نہ پڑھی ہو، اُسے چاہیے کہ وہ انہیں سورج طلوع ہونے کے بعد پڑھ لے"۔ (باب ماجاء فی اعادتھما بعد طلوع الشمس)

امام ترمذیؒ اس پر فرماتے ہیں کہ "بعض علمائے سلف کا عمل اسی پر ہے اور سفیان ثوری، ابن مبارک، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں"۔

سُنت اگر نمازِ فجر سے پہلے نہ پڑھی جاسکیں تو فرض جماعت کے معاً بعد اس کے پڑھنے کا جواز سنن ابی داؤد کی جس حدیث میں ہے، وہ یہ ہے:

عن قیس بن عمرو قال: رأی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجلاً یصلی بعد صلوٰۃ الصبح رکعتین، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: صلوٰۃ الصبح رکعتان۔ فقال الرجل انی لم اکن صلیت الرکعتین اللتین قبلھما فصلیتھما الان، فسکت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب ما فاتتہ ...... متی یقضیھا)

"حضرت قیس بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک

شخص کو دیکھا کہ وہ صبح کی نماز فرض کے بعد دو رکعت مزید پڑھ رہے ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صبح کی نماز تو دو رکعت ہے۔ ان صحابی نے عرض کیا کہ میں دو رکعت (فرض سے) پہلے نہیں پڑھ سکا تھا، اس لیے اب پڑھی ہیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا)۔

ان روایات کے سند و متن پر محدثین اور فقہائے مجتہدین نے اپنے اپنے طور پر کلام فرمایا ہے اور ان کے معنی و محل کی تعیین و تعبیر اور ان کے مابین تطبیق یا ترجیح کی سعی کی ہے۔ لیکن میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں، دونوں طریقوں کے حق میں سنت سے دلیل موجود ہے اور کسی مسلک کو بھی مکروہ یا غیر مندوب نہیں کہا جا سکتا۔ اہل علم کی بڑی تعداد کا عمل ایک یا دوسرے مسلک کے مطابق ہے۔

امام ابن عربی مالکی اپنی کتاب "عارضۃ الاحوذی شرح الترمذی" میں ان فجر کی سنتوں سے متعلق فرماتے ہیں:

من لم یصلھما حتی صلی الصبح فقال مالک یصلیھما اذا طلعت الشمس وقال الشافعی یصلیھما بعد صلوٰۃ الصبح وقد فعل ابن عمر مثل مذھب مالک۔

"جس نے یہ دو رکعتیں نہ پڑھی ہوں اور صبح کے فرض پڑھ لیے ہوں تو امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ وہ یہ دو رکعتیں طلوع آفتاب کے بعد پڑھے اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ صبح کی نماز کے بعد ہی پڑھ لے اور حضرت ابن عمرؓ نے بھی امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق عمل فرمایا ہے"۔

امام خطابیؒ معالم السنن شرح سنن ابی داؤد میں اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں:

اختلف الناس فی وقت قضاء رکعتی الفجر، فروی عن ابن عمر رضی اللہ عنہ انہ قال یقضیھما بعد صلوٰۃ الصبح وبہ قال عطاء، وطاؤس وابن جریج وقال طائفۃ یقضیھا اذا طلعت الشمس وبہ قال القاسم بن محمد وھو مذھب الاوزاعی والشافعی واحمد

واسحاق وقال ابوحنیفة واصحابه: ان احب قضاهما اذا ارتفعت الشمس فان لم یفعل فلا شیٔ علیه لانه تطوع۔

"فجر کی دو سنتوں کے قضا میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ انہیں صبح کی نماز کے بعد ادا کیا جائے اور حضرت عطاء، طاؤس، ابن جریج اسی کے قائل ہیں۔ اور ایک گروہ کا مسلک ہے کہ انہیں سورج طلوع ہونے کے بعد قضا کیا جائے۔ قاسم بن محمد، اوزاعی، شافعی، احمد، اسحاق رحمہم اللہ کا مسلک یہی ہے۔ اور ابوحنیفہؒ اور آپ کے اصحاب کا قول ہے کہ زیادہ پسندیدہ یہ ہے کہ سورج بلندی پر آجائے تو انہیں ادا کیا جائے، اگر قضا نہ ہو تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں کیونکہ یہ سنتیں ہیں، فرض نہیں ہیں)۔

(بقیہ بحث و نظر)

حضرت یونس والے واقعہ کو سید شیر محمد صاحب نے جس تحقیق سے ثابت کیا ہے وہ ایک (POSSIBILITY) کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے، بلکہ اسی طرح کا ایک واقعہ حوالتاً وہ تحریر بھی کرتے ہیں۔

اگر معجزات ممکن ہیں یعنی اگر ہم معجزات کی سائنٹیفک توجیہہ کر سکتے ہیں تو پھر معجزات کے منکر لوگوں میں اور معجزات کو سائنسی طور پر ثابت کرنے والوں میں کیا فرق ہوا۔ بات تو وہی رہی کہ کوئی امر بھی قانونِ قدرت کے برخلاف ظہور پذیر نہیں ہو سکتی اور معجزہ کو سائنسی طور پر ثابت کر کے ہم اسی بات کا اثبات کریں گے۔

اختر وسیم ڈار ۔ کراچی

مطبوعات

سفرِ فوز و فلاح | جناب خواجہ غفور احمد (ریٹائرڈ ایڈیشنل سیکرٹری واپڈا)

ناشرین: قومی پبلشرز، ۵۰ لوئر مال، لاہور ۱۔
دبیز کاغذ، طباعت جدید نوری نستعلیق۔ صفحات: ۳۳۶، جلد مضبوط، سنہری ڈائی، سہ رنگا گرد پوش از اسلم کمال۔ قیمت: ۱۰۰/- روپے

ہمارے ملک کے بار بار بنتے بگڑتے نظامِ سیاست کے پس پردہ مضبوط کرسیوں پر بیٹھ کر قواعد کا چوسر اور جوڑ توڑ کا گاف کھیلنے والی بیوروکریسی! ــــ اور (وہ بھی انگریزی سامراج کا تیار کردہ ماڈل) ــــ اس کی بنائی ہوئی مجہول بھلیاں میں کئی سال افسری کر کے جو لوگ کچھ متاعِ ایمان، کچھ سرمایۂ اخلاص، کچھ دولتِ احساسِ انسانیت اور کچھ ذوقِ مطالعہ بچا لے نکلتے ہیں، انہیں میں چھوٹا موٹا ولی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ معاملہ یہ ہے کہ "اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے"۔ خواجہ غفور احمد صاحب جن کی طرف سے برادرانہ محبت حاصل رہی ہے، ایسی ہی کمیاب شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ ان کے اندر ایمان نے جو "یک ذرّہ دردِ دل" سلامت رکھا، وہی انہیں سفرِ فوز و فلاح پر لے گیا۔ اور دعا ہے کہ جلدی ہی ایک بار پھر لے جائے۔

ایک بیمار جسم کے راہوار پر انھوں نے دیارِ حبیبؐ کے سفر کی کٹھنائیاں جس طرح برداشت کی ہیں، بالکل اسی طرح پہلے سے ادیب شہیر نہ ہوتے ہوئے انھوں نے اپنی کتاب سفرِ فوز و فلاح کو ایک نئی شان کے ادب کی آئینہ دار بنا دیا ہے۔ واصف علی واصف نے کہا: "یہ عطا ہے اور بڑی دلربا ہے"۔ شیخ منظور الٰہی فرماتے ہیں: "اسے سوزِ عشق کا کرشمہ کہیے کہ ایک خاک آلود

چنگاری فیضانِ الٰہی سے شعلۂ جوالہ بن کر دلوں کو گرمائے اور منور کرے"۔ مجیب الرحمٰن شامی نے لکھا: "اِس کوچے (تصنیف) میں ان کا یہ پہلا قدم ہے، لیکن عشق کی ایک جست نے ایسا قصّہ تمام کیا ہے کہ وہ بہت سے لکھنے والوں کو کہیں پیچھے چھوڑ گئے ہیں"۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے یوں اظہارِ تاثر کیا۔ "سفرِ فوز و فلاح ایک ایسی داستانِ شوق و جذب و مستی ہے جسے خونِ جگر سے رقم کیا گیا ہے"۔

اب میرے لیے اتنی ہی بات کہنے کو باقی رہ گئی کہ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے میں نے اپنے گذشتہ سفرِ حرمین کو خواجہ عفور احمد کی معیت میں اِس سرے سے اُس سرے تک ایک بار پھر طے کیا اور یہ بات میں اُن کو خط میں لکھ بھی چکا ہوں۔

باقی اس کے اندر کیا ہے؟ —— کا جواب جبھی ملے گا، جب آپ پڑھیں گے! خواجہ صاحب آپ کو پورا سفر کرا دیں گے اور ان کی نگارش کا نشہ آپ کو ذرا بھی تکلیف محسوس نہ ہونے دے گا۔

پاکستان اسٹیٹ آئیل ریویو خصوصی سیرت نمبر

بہ اہتمام جناب سید امجد حسین منیجنگ ڈائرکٹر پاکستان اسٹیٹ آئیل کمپنی لمیٹڈ۔ پی۔ ایس۔ او۔ نویں منزل، داود سنٹر، پوسٹ بکس نمبر ۳۹۸۳ - کراچی۔

مرتب سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم! جناب شاہ مصباح الدین شکیل۔

پاکستان اسٹیٹ آئیل کے کارپرداز اس لحاظ سے خاص قدر و احترام کے مستحق ہیں کہ ابھی تک اِن تیلوں میں تیل ہے۔ یعنی قوم کی مادی خدمت کے علاوہ وہ ایمانی و روحانی خدمات کی بھی راہیں نکالتے رہتے ہیں کیا عظیم الشان خدمت ہے کہ پی ایس او کے "ترجمان" جریدہ نے سیرتِ احمد مجتبیٰ پر متعدد ضخیم نمبر نکالے، پھر ان کے سارے مباحث یک جا مرتب کر کے ایک شاندار کتاب قوم کے ہاتھوں تک پہنچا دی۔ اس میں سیرتِ پاک کے دو بڑے ابواب بیان ہوئے۔ ۱۔ پیدائش سے حرا تک اور پھر ۲۔ غارِ حرا سے مسجد قبا تک۔ یہاں سے آگے مدینہ کی داستان ہے۔ اس داستان کا پہلا عنوان ہے "مسجد قبا سے میدانِ بدر تک"۔ یہ حصہ پی۔ ایس۔ او کے جرنل (ترجمان) ——

ماہ ربیع الاوّل ۱۴۰۸ھ، جلد ۱۰، شمارہ نمبر ۱: ۱۱ مطابق اکتوبر و نومبر ۱۹۸۷ء میں پیش کیا گیا ہے جو ہمارے سامنے ہے۔

بہت ہی شاندار سرورق، دونوں جانب سے تصویروں سے مزیّن، نفیس چھپائی، نئے طرز کے مباحث، تحقیق پر مبنی، زبان معتدل، یعنی عنوانوں میں شانِ ادبیت، (کہیں کہیں مصرعوں کا استعمال)، تصویریں، نقشے، خصوصاً سرورق کے دونوں طرف اندرونی جانب دیئے ہوئے بڑے نقشے بہت خوبصورت ہیں۔ لکھنے کا نقطۂ نظر صاف ستھرا اور فرقوں اور اختلافات سے بالاتر۔

اللہ تعالیٰ شاہ مصباح الدین شکیل صاحب اور سیّد امجد حسین صاحب اور پی۔ ایس۔ او کے ایسے تمام کارپردازوں کو جو اس نیک کام میں حصّہ دار ہیں، بہترین جزا دے۔

اہلِ ذوق اور محبانِ رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہم توجہ دلاتے ہیں کہ وہ ایسی شاندار چیز کو ضرور حاصل کریں اور صرف خود ہی نہ پڑھیں، بلکہ اپنے گھروں کے تمام افراد کے علاوہ دوستوں اور ملنے والوں کو بھی اس سے مستفید کریں۔ اس طرح تحریک کا ہر نسخہ صدقۂ جاریہ بن جائے گا۔ ملک کی تمام پبلک لائبریریوں اور یونیورسٹیوں اور کالجوں اور اسکولوں کی لائبریریوں میں بھی اس سلسلۂ سیرت کو موجود ہونا چاہیے۔

آئینۂ پرویزیت | از جناب عبدالرحمٰن کیلانی۔ ناشر: مکتبۃ السلام، گلی نمبر ۲۰، وسن پورہ لاہور طباعت کتابت مناسب۔ قیمت مکمل مجلد کتاب -/۱۰۰ روپیہ۔

حصّہ اوّل سے حصّہ ششم تک قیمتیں علی الترتیب: -/۱۲ روپے، -/۲۱ روپے، -/۱۵ روپے، -/۲۰ روپے، -/۱۸ روپے، -/۱۵ روپے۔

مؤلف جماعت اہلِ حدیث کی ایک متعارف شخصیت ہیں اور پہلے بھی متعدد اچھی کتابیں ان کے قلم سے آچکی ہیں۔

ہماری مغرب زدگی کے خاص خاص مظاہر میں سے ایک فتنۂ انکارِ حدیث ہے، جس نے مستشرقین کی طرف سے احادیث پر ہونے والے حملوں کے جواب میں علم و فکر کے میدان میں

بالکل ہتھیار ڈال دیئے ہیں، بلکہ ناک رگڑ دی ہے۔ کبھی کہا گیا کہ کتاب ہدایت و قانون صرف قرآن ہے۔ کبھی یہ کہ حدیثیں تو زیادہ تر وہ ہیں جو گھڑی گئی ہیں اور باہم متضاد اور فوق العقلی مضامین رکھتی ہیں، جو تھوڑی سی صحیح حدیثیں ہوں گی بھی، وہ محض دین کا تاریخی ریکارڈ ہیں۔ دینی رہنمائی کا سرچشمہ یا قانونی ماخذ نہیں ہیں۔ مولوی عبداللہ چکڑالوی نے سنت سے آزاد ہو کر جو مضحکہ انگیز اَن گھڑ سا تصورِ دین پیش کیا تھا، اس کے مقابلے میں ادارۂ طلوعِ اسلام نے اپنے طریقِ استدلال کو بہترین ادبی پیرایہ دیا اور "ابا حیت پسند" اور تن آسان طبقوں (خصوصاً افسروں) کو سامنے رکھ کر اسلام کا ایک ایسا ماڈل تیار کر دیا کہ ہینگ پھٹکری لگے بغیر شانِ مسلمانی کا بہترین رنگ آجاتا ہے۔ یہ بڑا کام ہے کہ قرآن کی آیات سے احادیث اور طریقِ سنت کے پہرے اٹھا دیئے جائیں۔ پھر قرآنی نصوص سے طرح طرح کے معانی برآمد کرنے کی راہیں کھول دی جائیں۔ ہر شخص اپنی مرضی کا دین بنائے اور مزے سے چار دن گذارے۔

اس عجمی فتنۂ عظیم کے سوتے دُور اور قریب کی تاریخ میں ملتے ہیں۔ اس فتنہ کا توڑ بھی ہر دَور میں خوب ہوا۔ خدا کا کام کرنے والوں نے اس کی اچھی طرح سرکوبی کی۔ پھر لمبے عرصے کے بعد اس کی کوئی نئی کونپل پھوٹتی ہے۔ ہمارے دَور میں خاصا کام ہو چکا ہے۔ جس میں زیرِ تبصرہ کتاب (آئینۂ پرویزیت) ایک اچھا اضافہ ہے۔

مؤلف جناب کیلانی صاحب نے "طلوعیوں" کی اٹھائی ہوئی ہر بحث اور مسئلے کا خوب تعاقب کیا ہے اور بات آخر تک پہنچا دی ہے۔ جتنے بھی بحثوں کے عنوان اور سلوگن اُدھر سے تیار کیے گئے تھے، ان سب کا ماہرانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ اونچے اونچے فلسفے، مرعوب کن تحقیقاتیں اور بحثیں، عقائد و عبادات سے لے کر اسلامی سیاست، معاشرت اور معیشت تک ـــ ساری چیزوں کو مصنوعی فلسفہ طرازیوں سے نکال کر قرآن و حدیث کی روشنی میں دکھایا گیا ہے کہ یہ سارا مال نواغیار کا ہے۔ دفاعِ حدیث اور تحفظِ سنت کے سلسلے کی گراں قدر کوشش ہے۔

باقی تفصیلی ابواب اور مختلف مسائل کے متعلق کیلانی صاحب کی کاوشیں کتاب پڑھنے ہی سے آپ کے سامنے آئیں گی۔ انکارِ حدیث کا ایک اور نیا سکول اُبھر رہا ہے جو بظاہر انکار نہیں کرتا، مگر صحیح حدیث کا معیار ایسا مقرر کرتا ہے کہ بس چند ہی احادیث بچ سکیں گی!

لوح بھی تو، قلم بھی تو مجموعہ نعت از راز کاشمیری مرحوم۔ مرتبین: پروفیسر غلام رسول عدیم، پروفیسر محمد اقبال جاوید۔ نظر ثانی: پروفیسر حفیظ تائب و علیم ناصری ـــ ناشرین: جناب عبدالرشید جناب محمد بابر لودھی، جناب رضی الرحمٰن بٹ۔ ملنے کا پتہ: عثمان اکیڈمی، حاجی پورہ، گوجرانوالہ۔ نفیس کاغذ اور چھپائی، رنگین اعلیٰ سرورق۔ قیمت: ۳۵/- روپے

مرحوم راز کاشمیری قریبی دوست اور محب بھی تھے اور شاعر تو تھے ہی، اُن کی شخصیت سامنے آتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ چلتی پھرتی مجسم نعت تھے۔ ان کا صبر و حلم، ان کا منکسرانہ مزاج، ان کا جذبۂ اخلاص وہ بنیادی عناصر تھے جن سے ان کی انسانیت کی تشکیل ہوئی تھی۔ وہ نعت نہ لکھتے تو کون لکھتا۔ کون اُن سے بڑھ کر اِس ایمانی فنِ شریف کی خدمت کے سزاوار تھا۔ جو کوئی ان کے مجموعہ نعت کو پڑھے گا تو وہ حیرت زدہ رہ جائے گا کہ نہ پیچیدگیٔ خیال، نہ مصنوعی شکوہِ الفاظ، نہ فنی کرشمے، بس بالکل سادہ زبان اور سادہ لفظوں میں سادہ سادہ جذبات و احساسات کا دھیما دھیما اظہار، بس جیسے کوئی چھوٹی سی سوت (سوتا)، کسی چٹان کی درز پر اُگی ہوئی گھاس کے نیچے سے آہستہ آہستہ اتر کر آرہی ہو اور نَو طلوع کردہ سُورج کی کرنیں اس کے بکھرتے قطروں سے کھیل رہی ہوں۔

جن اصحابِ دل اور اہلِ دماغ نے "لوح بھی تو......" کو مرتب کیا اور اس کو بار بار غور سے دیکھا اور پھر جن اربابِ نظر نے مختصر تعارفی کلمات لکھے، ان کے بعد میرے لیے کوئی بات کہنے کی نہیں رہ جاتی۔

صرف ایک شعر اور نثر کا ایک جملہ عرض کرتا ہوں:

؎ میری حضورؐ پاک سے نسبت ہے بس یہی
وہ جانِ صد بہار، میں بُستانِ آرزو

اور نثر: "وہ نعت نعت ہی نہیں جسے کہنے سے دل کی کثافتیں نہ دُھل جائیں"۔

خدا مرحوم کی اس پیش کش کو سرمایۂ آخرت بنائے!

ماہ سعید | مؤلفہ: حکیم محمد سعید صاحب ۔ ناشر: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ناظم آباد، کراچی ۱۸ ۔ کاغذ عمدہ، طباعت ٹائپ سے، سائز بڑا، ٹائیٹل دبیز، صفحات ۲۳۶ قیمت: ۵۰/- روپے ۔

محترم حکیم محمد سعید صاحب ایک جامع الصفات شخصیت ہیں ۔ انہوں نے جو مہمات اور جو ادارے اور مشاغل شروع کر رکھے ہیں، ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کس طرح ایک آدمی سے کئی آدمیوں کے کام لے لیتا ہے ۔

ماہ سعید اپنے مرکزی موضوع کے لحاظ سے ایک سفرنامہ ہے، مگر یہ سفرنامہ عجیب ہے، جس پر اب تک کے سفرنامہ نگاروں کے ایجاد کردہ تمام راستوں سے الگ ہو کر حکیم سعید صاحب کا مشاہدہ و خیال قلم کے اشہب پر سوار ہو کر نکلے ہیں ۔ باوجودیکہ اس میں کہیں کوئی مصنوعی افسانویت ٹھونسی نہیں گئی اور زبردستی کی فنکارانہ خیالی اڑانیں نہیں دکھائی گئیں ۔ مگر حقیقت نگاری کا انداز ایسا نفیس و لطیف ہے کہ افسانویت سے زیادہ فرحت انگیز۔ وہ پاکستان، جرمنی اور جاپان کی مرحلہ بہ مرحلہ سیر ہمیں کراتے ہیں اور کبھی دیکھنے کی چیزیں دکھاتے ہیں، کبھی سوچنے کے مباحث اٹھاتے ہیں، کبھی مجالس میں لے جاتے ہیں، کبھی شخصیتوں سے ملواتے ہیں — مگر اس ساری خارج بینی کے بعد ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ حکیم صاحب ہر طرف اپنی ہی تصویر کے نقوش بنا رہے ہیں اور ہم ان کا عکس ان کی عادات و روایات کے آئینے میں دیکھ رہے ہیں ۔ ان کی برپا کردہ تعمیری تحریکیں، ان کی ایجاد کردہ اصطلاحات اور پھر ان کا مصنوعیت سے پاک ادب "ماہ سعید" کو پڑھتے ہوئے حیرت میں ڈال دیتا ہے ۔

نہایت اہم بات یہ ہے کہ حکیم سعید صاحب کا کردار ایک ایسے مسلم کا سامنے آتا ہے جو ہر قسم کے احساسِ کمتری سے آزاد ہو ۔ وہ جابجا اسلامیت کے تقاضوں کو لطافت سے ابھارتے ہیں ۔ خصوصاً ۲۷ رمضان کو یومِ پاکستان قرار دینے کے لیے انہوں نے جو نوٹ لکھا ہے وہ بڑا اپیل کرنے والا اور موثر ہے ۔

حکیم صاحب کی اس کتاب میں سب سے زیادہ توجہ مسئلہ تعلیم پر دی گئی ہے اور پاکستان میں تعلیم کا "اسلامائزیشن" کا جو بے تکا عمل مسیحی تصورِ مذہب کے مطابق ہو رہا ہے ۔ وہ اس کے پس منظر میں سیکولرازم کی روح کو کارفرما دیکھتے ہیں

مشرقی ترکستان | مؤلف: عیسیٰ یوسف الپتگین - ترجمہ و تلخیص و حواشی از جناب ثروت صولت صاحب - بہ اہتمام: ادارۂ معارف اسلامی کراچی - ناشر: اسلامک پبلیکیشنز، شاہ عالم مارکیٹ لاہور - قیمت ۲۲/۵۰ روپے

ثروت صولت صاحب مورخانہ ذوق کے ساتھ ترکی زبان میں خاص دستگاہ رکھنے کی وجہ سے ترکی اور وسط ایشیا کی ترکستانی ریاستوں کے بارے میں (جو اپنا آزادانہ وجود کھو چکی ہیں) خاصا مطالعہ رکھتے ہیں اور ان کے تحقیقی و تصنیفی کام کا یہ خصوصی میدان ہے۔

اسی سلسلے میں ان کی ترجمہ کردہ تازہ کتاب مشرقی ترکستان شائع ہوئی ہے۔ حسب روایت پہلے اس علاقے کی قدیم روایت کا خاکہ درج کیا گیا ہے۔ نیز جغرافیائی حالات، تجارت، مواصلات، آبادی، زبان، تعلیم اور لٹریچر وغیرہ کا ذکر ہے۔ پھر مشرقی ترکستان پر کئی بار چین کا قبضہ ہونا مگر پھر کھدیڑ دیا جانا، ایک بار روس کا بھی مختصر دورِ تسلط، آخر میں ۱۸۷۶ء میں چین کا تسلط جو اب تک جاری ہے۔ اس سارے زمانے کی کشمکش کی داستان کتاب میں آگئی ہے۔

مشرقی ترکستان کے مسلمانوں کو سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور تہذیبی لحاظ سے جو لمبی آزمائش درپیش ہے، اس میں انہیں نہ پاکستان کی طرف سے کوئی کلمۂ ہمدردی نصیب ہوا، نہ جملہ عالمِ اسلام کی طرف سے ان کے زخموں پر کسی کی ہم نوائی نے مرہم رکھا۔ یہ لوگ ۱۲ نومبر کو سرکاری طور پر منائے جانے والے یوم جمہوریت کے ساتھ اپنی غلامی کے خلاف شبِ نفرت بھی مناتے ہیں۔
کتاب کے آخر میں مشرقی ترکستان کے مسلمانوں کی طرف سے اسلامی دنیا کے نام دردناک اپیل درج ہے جسے ہر مسلم ملک کے ہر فردِ مسلم کو پڑھنا چاہیے۔

ہفت روزہ "ندا" | مدیر مسئول: اقتدار احمد - دفتر: ۱۴ - افغانی روڈ، سمن آباد، لاہور - قیمت فی شمارہ ۶/- روپے، سالانہ ۲۵۰/- روپے

ہم اس نئے ہفت روزہ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ کسی ہفت روزے کے زندہ رہنے کے لیے جس طرح کے مضامین اور جیسی ترتیب اور گیٹ اپ کی ضرورت ہوتی ہے، ادارہ کے

پیشِ نظر ہے، بلکہ اشتہاری محاذ بھی مضبوط نظر آتا ہے۔ چھپائی کے لیے اپنا پریس، اولین حلقہ خریداری میں شامل ہونے کے لیے تنظیمِ اسلامی اور اس کے امیر کی بیعت کنندگان موجود! آگے خدا مدد کرے گا۔ ہماری اچھی تمنائیں اس کاروانِ صحافت کے ساتھ ہیں۔

خبرنامہ | ایڈیٹر: محمد یوسف اصلاحی۔ دفتر اشاعت: جامعۃ الصالحات، رام پور یوپی۔ ۲۴۴۹۰۱۔

ہم آزاد ریاست کے شہریوں اور حکمرانوں کو شاید یہ معلوم کر کے خوشی کے ساتھ شرم آئے گی کہ بھارت کی مجبور و مقہور مسلمان اقلیت کی ایک صف نے باپردہ طالبات کے لیے ایک مدرسہ مع دارالاقامہ قائم کر لیا ہے اور اس وقت اسی مدرسے کا ترجمان خبرنامہ ہمارے سامنے ہے۔

دینی حکمتِ تعلیم، خواتین کی تعلیم کے لیے اسلام کی رہنمائی اور امتحانات، کورسز، اسٹاف اور خاص خاص تقریبات کا حال خبرنامے میں چھپتا ہے۔

تمام مسلمانانِ ہند اور جامعۃ الصالحات کو قائم کرنے والوں کی خدمت میں مبارک باد!

بچوں کی کہانیاں حصہ اوّل | از جناب اکبر رحمانی۔ ناشر: ایجوکیشنل اکیڈمی، اسلام پورہ جلگاؤں ۴۲۵۰۰۱ بھارت۔ قیمت درج نہیں۔

اس کتابچے میں سادہ سے اندازِ طباعت کے ساتھ تین کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔ کہانیاں دلچسپ بھی ہیں، بچوں کی نفسیاتی طلب کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور ان سے اخلاقی سبق بھی اخذ ہوتے ہیں۔

استفسارات

از: سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

ترتیب و تدوین: اختر حجازی

- مولانا مرحوم فہمِ دین کے فن کے شناور تھے۔ ان کی مجلس سے کوئی تشنہ نہ اٹھتا تھا۔
- مولانا مرحوم سینکڑوں مجالس میں ہزاروں سوالات کے جوابات دیتے اور کوئی محروم نہ رہتا تھا۔
- مولانا کے ہزاروں معتقدین تھے جو طلبِ دین کیلیے اُن سے رجوع کرتے تھے اور کوئی مایوس نہ لوٹتا تھا۔
- یہ خصوصیت مولانا مودودیؒ کو خداداد صلاحیت کے طور پر حاصل تھی۔
- لوگوں نے ہزاروں سوالات کیے مولانا مودودیؒ نے ہزاروں جوابات دیے مولانا اختر حجازی صاحب کی ہمت اور محنت ہے، کہ انھوں نے ان سوالات کو مع جوابات حاصل کرکے ایک ایسا مجموعہ مرتب کر دیا جو تشنگانِ علم کیلیے سرچشمۂ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔
- ایک کتاب سے عالم کتاب بن جانے کا نسخہ حاضرِ خدمت ہے۔

سائز: $\frac{23 \times 36}{8}$ • صفحات: ۴۴۸ • قیمت: -/۴۰ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اُردو بازار ○ لاہور